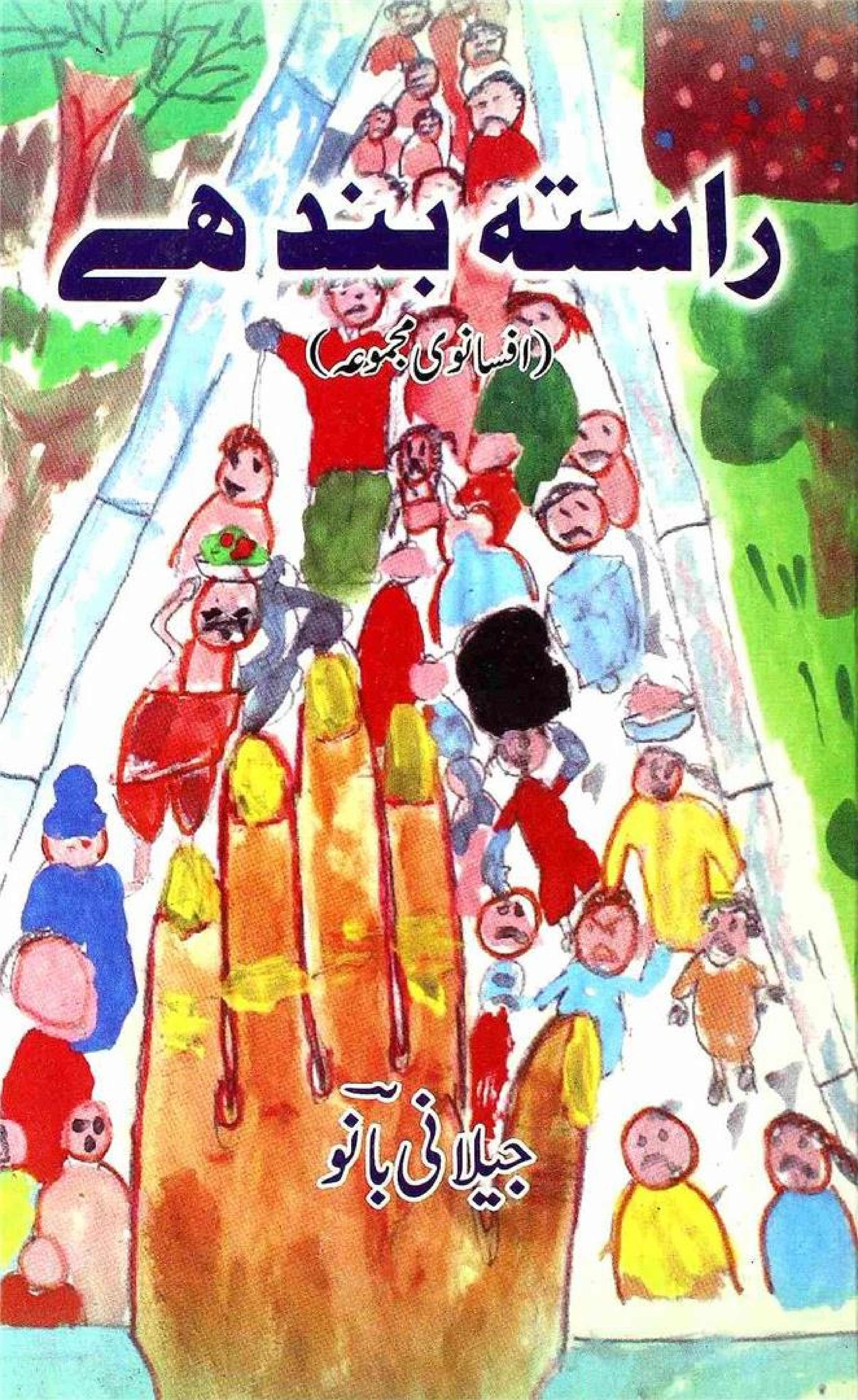
راستہ بند ہے
(افسانوی مجموعہ)
جیلانی بانو

راستہ بند ہے

(افسانوی مجموعہ)

راستہ بند ہے

(افسانوی مجموعہ)

جیلانی بانو

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ اشہر فرحان محفوظ!

RASTA BAND HAI

(Short Stories)

by

Jeelani Bano

Year of Edition 2010

ISBN 978-81-8223-611-0

Price Rs. 130/-

نام کتاب	:	راستہ بند ہے (افسانوی مجموعہ)
مصنفہ	:	جیلانی بانو
سرِ ورق	:	رجا فرحان
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۱۳۰ روپے
مطبع	:	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com

website: www.ephbooks.com

فہرست

-1	گن	7
-2	عباس نے کہا	8
-3	ایک دوست کی ضرورت ہے	18
-4	درشن کب دوگے ــــ؟	29
-5	کل رات ہمارے گھر مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے	36
-6	گُلِ نغمہ	46
-7	ایک شوٹنگ اسکرپٹ	60
-9	یہ شہر بکاؤ ہے	71
-8	اسے کس نے مارا؟	77
-10	جنت کی تلاش	80
-11	موت کے بیج	85
-12	کیا ٹوٹ گیا ــــ؟	91
-13	بھاگو بھاگو	94
-14	آپ کا سواگت ہے منتری جی ــــ	100
-15	پردہ گرتا ہے	102

-16	ایک خلاباز کی رپورٹ	108
-17	زومیں	109
-18	اکیلا سمندر	110
-19	کاش	112
-20	او کالے برقعے والی لڑکی—	113
-21	اکیلا (ناولٹ)	115
-22	راستہ بند ہے	145

☆☆

کُن

میرے اوپر ایٹمی ہتھیاروں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔
کیا ایک پل میں یہ دنیا مٹ جائے گی — ؟
جھوٹ اور مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔
میں سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی ہوں۔
کوئی وعدہ — ؟ کوئی معجزہ — ؟
پھر ایک بار ''کُن'' کی صدا کیوں نہیں آتی — ؟
ننھی رمشا نے میرے ہاتھ سے قلم چھین لیا ہے۔
وہ سفید کاغذ پر جھکی کچھ لکھ رہی ہے۔
میں انتظار کر رہی ہوں۔
کچھ تو لکھو کہ حرف چمک اٹھیں
کچھ تو بولو کہ روشنی ہو جائے۔

☆☆

عباس نے کہا—

''نمسکار— ''اب آپ آکاش سے سماچار سنیے—

آج کے مکھیہ سماچار—

عراق میں یدھ کی تیاریاں زوروں پر ہیں—

اس یدھ کو ٹیلی کاسٹ کرنے کے لیے امریکہ نے ساری دنیا کے ٹی۔وی چینلس سے کئی ملین ڈالرز کے کنٹریکٹ کیے ہیں۔ٹی۔وی چینلس کی ان کمپنیوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ عراق کی تباہی اور بربادی کے ایسے مناظر دکھائے جائیں جو اس سے پہلے کسی جنگ میں نہیں دکھائے گئے—اور عراق کے شہروں پر ان ہولناک ہتھیاروں کے برسنے کے بھی ہوں، جنہیں چھپا دینے کے الزام میں عراق کو برباد کرنے کا پلان بنایا گیا ہے—

اس لیے آج ساری دنیا میں ہلچل مچ گئی ہے—لوگ اپنے کام پر نہیں گئے— بچے اسکول نہیں گئے— عورتوں نے ساس بہو کی لڑائی والے سیریل نہیں دیکھے— کارٹون نٹ ورک اور ''پوگو'' کی بجائے سب عراق پر بمباری کے بعد انسانوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اور جلتے ہوئے شہروں کا تماشہ دیکھتے رہے—

اس یدھ کے بعد عراق کی تعمیر نو کے ٹھیکے حاصل کرنے کی دوڑ ساری دنیا کے بازاروں اور امریکہ کی تجارتی منڈیوں میں شروع ہو چکی ہے۔

امریکی گورنمنٹ ساری دنیا کی مارکیٹ سے ٹنڈر طلب کر رہی ہے—

تیل کے چشمے کون جلائے گا—؟ تیل کے ان چشموں کی آگ بجھانے کا کنٹریکٹ کسے ملے گا—؟

ایئرپورٹ اور بندرگاہوں کو کیسے تباہ کیا جائے گا—!

ان ٹھیکوں کے حق دار صرف وہی ملک ہوں گے جو عراق کو تباہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ دیں گے۔

اس یدھ کی تازہ جانکاری کے لیے اب ہم عراق چلتے ہیں اور عراق میں ہمارے سنوادداتا احمد سے بات کرتے ہیں—احمد—؟عراق یدھ کے بارے میں آپ ہمارے درشکوں کو کچھ بتائیں گے—؟

''اس یدھ سے فائدہ اٹھانے کے لیے امریکہ کے شیئر بازاروں میں بڑی چہل پہل نظر آرہی ہے—جو ملک اس یدھ کے خلاف کچھ نہ کہیں گے وہ بھی اپنے ٹنڈر بھر سکتے ہیں اور جو ملک اس یدھ کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کریں گے امریکی میزائلس کا رخ ان کی طرف موڑ دیا جائے گا۔

اس یدھ سے امریکہ اور اس کا ساتھ دینے والے ملکوں کو لاکھوں ڈالر کی آمدنی کی سمبھاؤنا ہے۔

اس جانکاری کے لیے دھنیہ واد!

اب آپ سی۔این۔این سے وصول ہونے والا ایک وشیش چتر دیکھیے—

سعودی عرب، کویت اور ایران کے ملکوں کے شاہوں نے اس یدھ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایسے شاندار محل بنائے ہیں جن پر کسی میزائل کا اثر نہیں ہوتا۔ان محلوں میں دنیا کی ہر آسائش ہے۔تمام شاہ اور شاہ بچے ٹی۔وی سیٹ کے سامنے بیٹھے ہیں اور عراق کی مقدس مذہبی عمارتوں، میوزیم، لائبریری اور کربلا پر بمباری کے مناظر دیکھ رہے ہیں۔ان شاہوں نے طے کرلیا ہے کہ وہ اس یدھ کے خلاف کچھ نہ بولیں گے مگر اس یدھ میں لڑنے والے بہادر سپاہیوں کے سر پر دستارِ فضیلت رکھیں گے—اس کے لیے ان جاں باز سپاہیوں کو حضور کے آگے سر جھکانے کی ضرورت نہیں ہوگی—حضور کے آگے ان سپاہیوں کے صرف سر لائے جائیں گے—آپ جانتے ہیں کہ ہمیشہ بادشاہوں نے اسی طرح فن کاروں، ادیبوں اور بہادر سپاہیوں کو نوازا ہے—

اب ہم تازہ جان کاری کے لیے آپ کو نجف اشرف کی طرف لے چلتے ہیں—

یہاں بم کے دھماکوں سے ہر طرف آگ اور دھواں پھیلا ہوا ہے۔لوگوں کے رونے

چلا۔نے کی آوازیں،ہمارے درشک سن رہے ہوں گے—

ہمارے سامنے سے بے شمار انسان ،روتے ہوئے بچے،زخمی عورتیں پناہ ڈھونڈنے کے لیےادھراُدھر بھاگ رہے ہیں— آپ ان کی آوازیں سن سکتے ہیں—

''یاعلی—یامولاعلی مشکل کشا—ہمیں اپنے پاس بلالو— حضرت علی کے سائے میں چھپالو— میرے مولا— میری مدد کرو— کوئی ہے—؟ کوئی ہے؟— میرے بچے کو بچالو—''

ایک لنگڑا بوڑھا آدمی چھوٹے سے بچے کی انگلی تھامے،بمباری سے بچنے کے لیے بھاگنے کی کوشش کررہا ہے۔وہ دونوں ڈر کے مارے زورزور سے رورہے ہیں—بوڑھا زورزور سے چلارہاہے—

''مولاعلی— مشکل کشا— مجھے اپنے پاس بلالو— میرے بچے کو اپنے سائے میں چھپالو—''

''رُک جائیے حضرت— آپ حضرت علی کے مزار کی طرف مت جائیے—''

میں اس بوڑھے آدمی کو روک کرکہنا چاہتاہوں— مگر اسے یہ بات کیسے سناؤں کہ حضرت علی کے مزار کی دیواریں بم کے دھماکوں سے ٹوٹ رہی ہیں—ہر مشکل وقت پر مولاعلی مشکل کشا کو پکارنے والا کوئی بھی انسان اس بات پر یقین نہیں کرے گا۔وہاں امریکی میزائیل آگ برسارہے ہیں—

آیئے—اب ہم آپ کو اس میٹنگ میں لے چلتے ہیں جو جارج بش نے اپنے مشیروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کو بلائی ہے۔مگر اس دستورِ زباں بندی میں سب چپ چاپ بیٹھے ہیں اورزمین سے آسمان تک صرف بش کی آواز گونج رہی ہے—

ہمارے سنوادداتا کے ایک سوال کے جواب میں ایک امریکی فوجی کمانڈر نے کہا۔

''ہم امریکی ایک کلچرڈ قوم کے نمائندے ہیں—ہم عراق کے عوام کو کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے،اسی لیے ہم نے عراق کے اسکولوں،تاریخی لائبریری،میوزیم،مقدس مزاروں کو آگ لگائی ہے۔میں اسلام کی تاریخ اور تہذیب کو کتابوں اور میوزیم میں محفوظ رکھا گیا ہے—

''اب امام حسین،حضرت علی—اوریزید کے دوروالے قصے،اپنے اسلاف کے کارنامے

پڑھنے سے عراق کے بچے محروم ہو جائیں گے۔ پھر عراق میں حسین، علی عباس جیسے بچے کی پیدائش کا کوئی ڈر نہیں رہے گا—''

''تو کیا آپ سارے عراق میں آگ لگانے والے ہیں—؟

''نہیں—ہم نے تیل کے چشمے، ایئر پورٹ، سرکاری عمارتوں اور قومی شاہراہوں کو تباہ نہیں کیا ہے۔''

دھنیہ واد آپ کی اس جان کاری کے لیے—

اب ہم اپنے عراق کے سنوادد! تا ندیم سے بات کریں گے—

''ندیم—بمباری سے تباہ ہونے والے شہروں میں امریکی فوج کوئی امدادی کام کر رہی ہے—؟

''ہاں—آپ کو یاد ہوگا کھاڑی یدھ میں سمندر میں تیل پھیل جانے سے سمندر کے پرندے بیمار ہو گئے تھے—! اور اس کے لیے ساری امریکن قوم دکھی ہو گئی تھی—! ان کی صحت کے لیے امریکن گورنمنٹ نے بے شمار دولت خرچ کر دی تھی۔ ان پرندوں کے پروں سے تیل پونچھ کر، انہیں نہلا کر، دوائیں اور انجکشن دے کر، انہیں زندگی کی طرف موڑا، اڑنا سکھایا تھا—؟ اب عراق کی یدھ میں بھی امریکن گورنمنٹ نے اپنی فوج کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے مزائلز کا رخ عراق کے شہروں اور میوزیم کی طرف کر دیں۔ سمندر کے پرندوں کو پریشان نہ کریں۔''

ہمارے ایک سوال کے جواب میں ایک امریکی کمانڈر نے کہا۔

ہمارے مزائلز کا رخ ان احمق عراق بچوں کی طرف ہوگا اب جو اپنی ماؤں سے پوچھ رہے ہیں۔

''مستقبل کسے کہتے ہیں—؟''

''ندیم! کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ عراق میں روتے ہوئے بچے کسے پکار رہے ہیں—؟ کیا اُن کی مدد کو کوئی آنے والا ہے—؟

''شاید آپ کو یاد ہوگا کہ جب علی کا بیٹا، محمد کا نواسہ یزید کے آگے سینہ سپر ہو گیا تھا تو

کچھ ساتھیوں نے اسے ہمت دلائی تھی۔ان کے ساتھ آنے کا وعدہ کیا تھا۔مگر وہ اپنی عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر کربلا کے میدان تک پہنچنے کی ہمت نہ کر سکے ——اور——اور پھر—— ؟ٹھہریے—— رک جایئے——وہاں دور مجھے کچھ نظر آرہا ہے——

’’ندیم——اس وقت تم کہاں ہو اور کیا وہاں امن کی کوشش کرنے کے لیے کسی ملک سے کوئی منسٹر آنے والا ہے—— ؟‘‘

’’میں اس وقت دریائے فرات کے کنارے کھڑا ہوں——عراق کے آسمان پر مزائلز منڈلا رہے ہیں۔ہر طرف آگ اور دھواں پھیلا ہوا ہے——بہت دور——عرب کی کھاڑی کے کنارے ایک عرب شہزادہ اس لڑائی کی قلم بندی کر رہا ہے——

میں اس کے پاس جا کر پوچھتا ہوں——

’’اے عرب کے نوجوان شہزادے——!آج پھر کربلا کے میدان میں یزید کی فوجیں گھس آئی ہیں——تم نے تو حسین کے ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا——آگے کیوں نہیں بڑھتے—— ؟

حضرت علی کے مزار پر بم برسانے والوں کا راستہ کیوں نہیں روکتے—— ؟

وہ عرب شہزادہ گردن جھکا کر کہتا ہے——

’’ہمیں حسین اور ان کے اصول بہت عزیز ہیں۔ان کی طرف بڑھنے والے جھوٹ اور ظلم کے ہر ہاتھ کو میں توڑ دینا چاہتا ہوں—— مگر پھر ان ظالموں کے ہاتھ ہماری طرف نہ اٹھ جائیں——میرا باپ عرب کا کنگ ہے——وہ اپنے سر پر سجے ہوئے تاج کو نہیں اتار سکتا۔فرعون اور شداد——یزید اور بش——سب اپنے مشن کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔میں بھی ان ظالموں کے خلاف ہاتھ اٹھانا چاہتا ہوں۔مگر انہوں نے میرے ہاتھ باندھ دیے ہیں——‘‘

اب ہمارے درشک عرب شہزادے کے پھیلے ہوئے ہاتھ۔ٹی۔وی اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں جن میں ڈالر سے بھری ہوئی تھیلیاں لٹک رہی ہیں——

’’آیئے——اب ہم آپ کو ایک ایسی خندق کے پاس لے چلتے ہیں جو امریکن فوج نے عوام کی حفاظت کے لیے بنوائی ہے——اندر جانے والوں کی لمبی قطاریں ہیں——

جانے کون سی منزلوں، کون سی وادیوں سے گزر کر عراق کے عوام کا یہ قافلہ سخت جان، ان خندقوں تک پہنچا ہے۔یہ اب ان کی آخری پناہ گاہ ہے——

وہ دیکھیے — خندق کی طرف بھاگتے ہوئے لوگوں کا ہجوم ہے —

بچارے — موت سے بچ کر کسی کی پناہ چاہتے ہیں — عراق کے وہ جیالے عوام، جنہوں نے حق اور سچائی کی ہر لڑائی جیتی اور موت انہیں نہ مار سکی۔

ایک امریکی فوجی انہیں حکم دے رہا ہے —

''جلدی جلدی آؤ اور ہماری پناہ گاہوں میں چھپ جاؤ۔

بوڑھوں، بچوں اور زخمی سپاہیوں کو باہر ہی چھوڑ دو — اندر جانے سے پہلے اپنے چہرے پر ماسک چڑھالو — پھر تم کچھ نہ دیکھ سکو گے — کچھ نہ سن سکو گے۔

یہ خندقیں ان عراقی نوجوانوں کے لیے بنائی گئی ہیں جو بش کے حکم پر سر جھکا دیتے ہیں۔''

''میرا نمبر کون سا ہے —؟ خندق کے اندر جانے سے پہلے ایک عراقی نوجوان پوچھ رہا ہے۔''

''یہ تو آنے والا امریکی میزائل تمہیں بتا دے گا۔''

''نوجوانو — خندق کے اندر چھپ جانے سے پہلے نیند لانے والی وہ دوا کھالو جو آج عرب کے ہر نوجوان کو کھلائی جا رہی ہے۔ پھر وہ امریکی لیڈروں سے سوال کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

خندق کے اندر جانے والے نوجوانو —! اپنے وصیت نامے ہمیں دے دو —

اندر جانے والوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے کل زندہ رہنا ہے —

ہمارے در شک دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے سامنے سے بار بار کالی چادر اوڑھے ایک عورت اِدھر اُدھر بھاگ رہی ہے — رو رہی ہے — چلا رہی ہے —

اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ رو رہا ہے —

پھر وہ عورت میری طرف دیکھ کر پوچھتی ہے —

''کون ہو تم — کیا نجف اشرف سے کوئی خبر لائے —؟ مجھے سچ بتاؤ —

نجف اشرف پر تو کوئی بم نہیں گرا ہے —؟ یا مولا علی — مشکل کشا —

حسین — حسین — عباس — عباس — تو کہاں ہے بیٹے —!

مجھے پیاس لگی ہے — میرا بچہ پیاسا ہے — ارے کوئی ہے —؟

عباس کو بلاؤ — وہ روز دریائے فرات سے اپنی مشک میں پانی لاکر پیاسوں کو پلاتا ہے — آج پھر کربلا کی رات آگئی ہے — وہ اپنے پیاسے بھائیوں کے لیے پانی لے کر کیوں نہیں آتا — ؟

ہمارا اسنواد داتا اس عورت کے پاس جاتا ہے۔ مگر وہ روک دیتی ہے —

ابھی چپ رہو — مجھے قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگنے دو —

''یا اللہ — میرا خاوند، میرا عباس — میرا گھر کہاں ہے — !

انہیں اپنی حفظ وامان میں رکھو — ''

وہ عورت گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے۔

''اتنی آگ کس نے لگائی ہے۔ اس دھوئیں میں میرا قبلہ چھپ گیا ہے —

''میں اذان کی آواز کیسے سنوں گی — ارے کافرو! — تم نے مزائلز کی گھن گرج میں اذان کی آواز بھی گم کر دی ہے — ''

ہمارا اسنواد داتا اس عورت کے پاس جاتا ہے۔ مگر وہ روک دیتی ہے —

''ٹھہرو — مجھے قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا مانگنے دو۔

''بی بی! تم اپنا نام بتاؤ گی — ؟''

''تم — ؟ کون ہو — ؟ عورت روتے ہوئے بچے کو اپنی کالی چادر میں چھپا کر دور ہٹ جاتی ہے۔

''میں ایک ٹی۔ وی چینل کا نیوز رپورٹر ندیم ہوں۔ بی بی — اپنا نام بتاؤ گی ہمیں — ؟''

''تم کیا جانو میں کون ہوں؟ وہ عورت بڑے غرور کے ساتھ اپنا سر اونچا کر کے کہتی ہے۔

''میں اس زمین کی ماں ہوں جہاں غرور کا ہر شیشہ شکست ہوا ہے۔''

پھر وہ اپنی گود کے بچے کا سر اونچا کر کے اس سے کہتی ہے۔

''دیکھ — دیکھ میرے بیٹے — اوپر کی طرف دیکھ — تیرا بھائی عباس اب پانی کی مشک لے کر آئے گا — جب بھی دشمن ہمیں مارنے آئے ہیں عباس اپنی مشک میں پانی بھر کے زخمیوں کو پلاتا ہے۔''

وہ عورت آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چاروں طرف دہکنے والی آگ اور دھوئیں کے پار کچھ

دیکھ رہی ہے۔

پھر وہ اپنی گود میں روتے ہوئے پیاسے بچے سے کہتی ہے۔

''اوپر کی طرف دیکھو ––– وہ اب آجائے گا۔''

ہر ماں اپنے بچے کو ہمیشہ اوپر کی طرف دکھاتی ہے ––– کوئی وعدہ ––– امید کا جگمگاتا ہوا چاند ––– امن کا پیغام لانے والی چڑیا ––– ہاتھوں میں پانی کی مشک اٹھائے دوڑتے ہوئے عباس ––– بچہ اوپر کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر قہر کی آگ برساتے ہوئے میزائل کی آواز سن کر ماں کی گود میں چھپ جاتا ہے –––

وہ عورت گھبرا کے ہمارے سنواد داتا ندیم سے پوچھ رہی ہے –––

''کیا تم جانتے ہو میرا عباس آج پیاسوں کو پانی پلانے کیوں نہیں آیا ––– !

کیا اہل کوفہ ہماری مدد کے لیے آرہے ہیں ––– تم کیا خبر لائے ہو ––– ؟

''خاتون محترم ––– ابھی ہمیں ایسی کوئی جان کاری نہیں ملی کہ کسی اور سے کوئی تمہارے لیے پانی لانے والا ہے۔

اچھا ––– ؟ وہ عورت غصہ اور نفرت سے اپنا منہ پھیر لیتی ہے۔

''شاید تمہیں ابن زیاد نے بھیجا ہے ––– فرات کے کنارے بھوکے اور پیاسے زخمی عراقیوں کا تماشہ ساری دنیا کو دکھانے کے لیے آئے ہو ––– ؟ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے ––– اپنے کیمرے ہٹالو –––

مجھے دیکھنے دو ––– وہ سب کہاں ہیں جنہوں نے اس لڑائی میں حسین کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا ––– ؟

میرا عباس کہاں ہے ––– عباس ––– عباس ––– عباس ––– ؟

ہمارے درشک سن رہے ہیں ––– اس عورت کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی ہے ––– سارے عرب میں ایران، کویت، افغانستان، پاکستان تک ––– دور دور تک پھیلے ہوئے ریت میدان اور تیل کے چشموں سے آگے ––– ہمیں تو اس پیاسی ماں کی پیاس بجھانے کے لیے کوئی اس طرف آتا دکھائی نہیں دیتا –––

شاید وہ عورت نہیں جانتی کہ اب آسمان سے نہ کوئی کتاب اترے گی نہ کوئی رسول آئے گا۔

آیئے—اب ہم دریائے فرات کے کنارے .بمباری سے تباہ ہو جانے والے ایک شہر کی طرف چلتے ہیں—یہ پورا شہر تباہ ہو گیا ہے۔ ہر طرف آگ لگی ہے۔لاشیں پڑی ہیں۔ یہاں کیا ہو رہا ہے۔اس کی جانکاری کے لیے ہم اپنے سنواددا تا منیش سے بات کرتے ہیں۔

منیش—دریائے فرات کے کنارے شہر بغداد پر اتنی بمباری ہوئی ہے۔اس کے بارے میں آپ ہمارے درشکوں کو کچھ بتائیں گے—؟

''نمسکار—دو دن تک مسلسل بمباری سے یہ پورا شہر تباہ ہو گیا ہے۔

اس وقت میں جہاں کھڑا ہوں وہاں ایک پورا بازار اور اسکول ابھی تک جل رہا ہے—

یہاں ایک اسلامی تاریخ کا میوزیم تھا اور ایک لائبریری تھی—ایسا لگتا ہے اسی جگہ کو تباہ کرنے کے لیے اتنی بمباری کی گئی ہے۔کیونکہ ابھی تک آگ بجھانے کے لیے فائر انجن بھی نہیں آئے ہیں—

''منیش—؟ کیا تمہیں وہاں کوئی زندہ انسان نظر آرہا ہے.جس سے معلوم ہو کہ میوزیم اور لائبریری پر بمباری کیوں کی گئی ہے—؟

''نہیں—ہمارے چاروں طرف ہر چیز جل چکی ہے۔ٹوٹے ہوئے گھروں کے نیچے لاشیں پڑی ہیں۔کچھ زخمی لوگ چلا رہے ہیں۔امریکی فوج کی لاریاں ان زخمیوں کو اٹھا کر لے جا رہی ہیں۔''

''ان زخمیوں کو کہاں لے جا رہے ہیں—؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم— مگر جنگ شروع ہونے سے پہلے امریکہ کی بڑی بڑی کمپنیوں نے عراق کے زخمیوں اور لاشوں کو اٹھانے کے ٹھیکے لے لیے ہیں۔''

''منیش—دھنیہ واد اس جان کاری کے لیے—''

آیئے—اب ہم آگے چلتے ہیں— مگر—ذرا ٹھہریے—مجھے یہاں ایک بچے کے رونے کی آواز آرہی ہے—

ہمارے درشک دیکھ رہے ہیں—یہاں ہر طرف لاشیں پڑی ہیں—آیئے—اس جلے ہوئے گھر کے اندر چلتے ہیں—اوہ—اتنی تباہی—؟ ذرا رک جایئے—

وہاں ایک دس گیارہ برس کا زخمی بچہ رو رہا ہے—اکیلا پڑا ہے—

مجھے اس لڑکے کے پاس جانے کے لیے لاشوں کو پھلانگنا پڑ رہا ہے۔ چاروں طرف خون بہہ رہا ہے۔ میرے ساتھ ایک امریکی سپاہی بھی ہے وہ زخمیوں کو اٹھانے کے لیے آئے ہیں—

وہ بچہ زخموں سے تڑپ رہا ہے— میرے پاس کھڑا امریکی سپاہی مجھے بتاتا ہے۔

''اس لڑکے کا نام علی اسماعیل عباس ہے۔ اس لڑکے کے دونوں ہاتھ کٹ گئے ہیں—

وہ زور زور سے رو رہا ہے۔ چلا رہا ہے—

''میرے ماں باپ کو بش نے مار ڈالا— میرے دونوں ہاتھ کٹ گئے— اب میں پیاسے زخمیوں کو پانی کیسے پلاؤں گا—؟ میری ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی—''

''تم ٹھیک ہو جاؤ گے عباس—'' وہ فوجی بچے کو تسلی دے رہا ہے۔

''ہم تمہیں امریکہ بھیج رہے ہیں— وہاں تمہارا علاج ہوگا— تمہیں پھر ہاتھ مل جائیں گے—''

''نہیں'' عباس نے غصہ میں فوجی سے کہا۔

''مجھے امریکہ کے ہاتھ نہیں چاہئیں—'' وہ نفرت سے پاؤں پٹکنے لگا۔

''میں امریکہ نہیں جاؤں گا۔ مجھے تو امریکہ سے لڑنا ہے۔ عراق کے پیاسے سپاہیوں کو پانی پلانا ہے۔''

''مگر تمہارے ہاتھ کٹ گئے ہیں عباس— تم کیسے لڑو گے—؟''

خون میں ڈوبا ہوا عباس لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور غصہ میں چلا کر بولا—

''بش نے ہاتھ کاٹ دیے ہیں— مگر میں اسے لات مار سکتا ہوں—''

''عراق یدھ کے اس آخری سماچار کے ساتھ اب ہمیں آگیا دیجیے— نمسکار—!''

☆☆

ایک دوست کی ضرورت ہے

''۶۵ سال کے ایک ریٹائرڈ شخص کو ایک دوست کی ضرورت ہے۔
اس کی فیملی ہے۔ علم، ادب، آرٹ اور سنگیت کا شوقین ہے۔
دوست کی کسی بھی کمزوری اور کوتاہی کو نظرانداز کر کے ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔''
نیوز پیپر میں اشتہار پڑھ کر ڈاکٹر نایک ہنسنے لگے۔
''۶۵ برس تک سے کوئی دوست نہیں ملا؟''
''جانے کتنے دوستوں سے دشمنی کر چکا ہے؟'' راشد نے کارڈ بانٹتے ہوئے کہا۔
''اسی لیے اسے اب بھی کوئی دوست نہیں ملے گا۔'' وہ سب ایک ساتھ ہنسنے لگے۔
''۶۵ برس گزار دیئے اس نے کسی دوست کے بغیر! کتنا اکیلا ہوگا وہ! میری طرح......''

سورن سنگھ سر جھکا کر سوچنے لگا...... گھر میں بیوی ہے۔ بچے ہیں...... آس پاس دوست بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں رمی کے کارڈ لیے ہر طرح سے مجھے مات دینا چاہتے ہیں...... جس کی طرف ہاتھ بڑھاؤں وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے......

سورن سنگھ نے چائے کا کپ رکھ دیا...... بے بسی سے ہاتھ ملنے لگا۔

انوار کا دن تھا...... وہ سب رمیش کے گھر بیٹھے ہی کھیل رہے تھے۔

رمی تو ایک بہانہ تھا...... ہفتے بھر کی تھکان اور بوریت کم کرنے کے لیے وہ سب کسی ایک جگہ ساتھ بیٹھ کر خوب ہنستے۔ بیئر پیتے...... بیوی بچوں سے دور...... آفس سے دور...... سیاسی دہشت سے دور...... جو دوست وہاں نہیں ہے اس کی برائیاں کر کے جی خوش کرتے۔

''بور کرتا ہوگا سالا دوستوں کو...... تمہاری طرح......'' نایک نے بیئر کا گلاس اٹھا کر کہا۔

''تو پھر تم بن جاؤ اس کے دوست...... ڈاکٹر ہو اس کے دکھ کی دوا دے دو......'' سب

ہنس پڑے۔

''اتنے دوست یہاں بیٹھے ہیں۔ان کے ظلم وستم کچھ کم ہیں کہ ایک اور ہارٹ پیشنٹ کو لے آؤں......؟''

وینکٹ کے تھپڑ سے بچتے ہوئے نائیک نے کہا۔

''اشتہار یوں دیا ہے جیسے ایک نوکر کی، ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے۔''

''سالا سمجھتا ہے۔دوست بھی مارکیٹ میں بک رہے ہیں۔''

ریاض نے کارڈ ٹیبل پر ڈال کر سگریٹ منہ میں دبایا۔

''کیا میرا کوئی دوست ہے؟ یہ بات امتیاز نے سگریٹ کے ساتھ جلائی اور لائیٹر دبا کر بجھادی۔

''اسے ایک دوست کی ضرورت ہے۔مگر دوست کون ہوتا ہے۔۶۵ برس میں بھی اسے پتہ نہیں چلا۔''

''تمہاری صورت دکھادیتے ہیں اسے۔پھر توبہ کرلے گا دوست بنانے سے۔''

سورن سنگھ نے امتیاز کے گھونسے سے بچتے ہوئے کہا۔

''ہاں میری صورت دکھادو اسے......'' امتیاز نے گردن جھکالی۔

یہ سب جو میرے پاس بیٹھے ہیں......کیا میرے دوست ہیں؟ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہم سب دوسروں کی غلطیوں، کوتاہیوں کی تاک میں رہتے ہیں اور پھر اس کی حماقت پر سب کے قہقہے ایک ساتھ گونج اٹھتے ہیں۔

''سالا بور کرتا ہوگا گھر والوں کو......بیٹی کالج سے کیوں نہیں آئی......بیٹا کہاں گیا......بیوی نے فون پر کس سے بات کی......تم کہاں جارہے ہو؟

یہ سب شکایتیں اس کے گھر والوں کو امتیاز سے تھیں۔

وہ دوستوں کو اپنے گھر کے مسائل سناتا رہتا تھا۔

امتیاز کو آج ہی کی بات یاد آئی۔

وہ دہلی میں جس لڑکی سے ملا تھا اس کا آج فون آنے والا تھا۔

اس نے بیوی سے کہا۔

''میرے لیے ایک لڑکی کا فون آئے گا۔اس سے کہنا میں گھر پر نہیں ہوں۔شام کو کلب میں ملے۔''

تھوڑی دیر بعد فون آ گیا۔ بیوی نے فون اٹھا کر کہا۔

''تم آج مت آؤ۔امتیاز گھر میں ہیں۔''

اسے غصہ آ گیا۔

''میں نے کہا تھا اس لڑکی سے کہنا میں گھر پر نہیں ہوں۔''

''مگر وہ فون میرے لیے تھا......'' بیوی نے مسکرا کے کہا......

اب وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نہ پیئے تو کیا کرے!

مگر آج سب کو قہقہے لگانے کے لیے ایک بات مل گئی تھی۔

''پہلے تو یہ بتاؤ یار کہ کیا ہم کسی کے دوست بن سکتے ہیں؟''

راشد کے اس سوال پر سب ہنسنا بھول گئے۔سورن سنگھ کے ہاتھ سے کچھ کارڈز نیچے گر گئے۔نائیک نے بیئر کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔جب سے ڈاکٹر نائیک سول سرجن ہو گیا ہے یوں بات کرتا ہے جیسے یہاں سب دل کے مریض بیٹھے ہیں جن کا انجیوگرام ہوگا......

''تھک گئے یار اب......امتیاز نے کارڈز ٹیبل پر ڈال کر انگڑائی لی......

''او سادھنا......وہی بڑے کھلانے کے لیے اور کتنی دیر ترسائے گی تو......؟''

یہ بات سب جانتے تھے کہ دہی بڑے کھانے کے بہانے امتیاز تھوڑی دیر سادھنا سے ہنسی مذاق چھینا جھپٹی کرنا چاہتا ہے۔گروپ کے سب ہی کا کسی نہ کسی کی بیوی سے رومانس چلتا رہتا تھا۔

مگر راشد کو ایک ہی فکر تھی آج......

''جانے وہ ہندو ہے یا مسلمان؟''

''مسلمان ہے تو ریٹائرڈ ہونے کے بعد حوروں کو ہتھیانے میں جٹ گیا ہوگا۔''

رمیش کی بات پر سب ہنس پڑے۔

''اور ہندو ہے تو رام رام جپنا، پرایا مال اپنا کر رہا ہوگا۔'' امتیاز نے کہا۔

''یار سورن سنگھ۔تو بھی بتادے کہ جب تیرے بارہ بج جائیں گے تو کیا کرے گا؟''

''اخبار میں اشتہار دوں گا کہ ایک اور دشمن کی ضرورت ہے......''

زوردار قہقہوں کے ساتھ سب بریف کیس سنبھال کر کھڑے ہو گئے......

اگلی اتوار کو......

ایک بہت شاندار خوبصورت بنگلے کے سامنے ایک ساتھ کئی کاریں رُک گئیں......اور وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔پھر زور زور سے ہنسنے لگے۔

''میں نے سوچا ذرا دیکھ آؤں کہ وہ کون احمق ہے جسے ابھی تک ایک دوست نہیں ملا......''

''ہاں......میں نے بھی یہی سوچا تنہا انسان کو کیوں نہ سہارا دیا جائے......''

وہ سب زور زور سے ہنستے ہوئے آگے بڑھے......

بہت شاندار گھر تھا......پھولوں سے بھرا ہوا لان......

واچ مین نے سب کا نام پوچھا......اور پھر آگے بڑھ کر دھیرے سے بیل بجائی......

ایک خوش شکل اسمارٹ شخص نے دروازہ کھولا......

اونچا پورا، ادھیڑ عمر والا، سفید کھادی کا کُرتا پاجامہ پہنے......سفید بالوں سے ڈھکا ہوا سر......ایک کھلی ہوئی کتاب ہاتھ میں تھامے......وہ سب کو دیکھ کر گھبرا گیا......

''آپ......؟ آپ کون......؟ سوری......میں نے آپ کو نہیں پہچانا......''

''آپ ہمیں اس وقت بھی نہیں پہچانیں گے جب ہم آپ کے دوست بن جائیں گے۔''

سورن سنگھ کے ساتھ ہم سب زور زور سے ہنسنے لگے......

''اچھا......اچھا......آپ سب میرے دوست بننے کے لیے آئے ہیں......؟ آئیے۔ آئیے۔''

اس نے ایک طرف جھک کر بڑے خلوص کے ساتھ ہم سب کو اندر بلایا......اور پھر ایک شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا......

''میں شیام ہوں......کام تو آرکیٹکٹ کا کرتا تھا۔مگر کچھ بھی نہ بنا سکا۔صرف توڑ پھوڑ

کرتا رہا......اور......اور کیا کہوں؟'' وہ ادھر اُدھر دیکھ کر سر کھجانے لگا۔

''میں خود نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟''

سب ہنسنے لگے......

ڈرائنگ روم میں ماڈرن آرٹ کی پینٹنگیں تھیں۔ قیمتی فرنیچر......سنگ مرمر کے ایک اونچے استھان پر پتھر کی مورت بنی میرا ہاتھ میں اکتارہ لیے سر جھکائے بیٹھی تھی......جیسے سوچ رہی ہو۔ کون گلی گئیو شیام؟

ٹیبل پر بیئر کی خالی بوتل، بھرا ہوا گلاس، سیل فون اور نیوز پیپر رکھا تھا۔

سب کو بٹھانے کے بعد اس نے بیئر کا گلاس اور بوتل ٹیبل پر سے اٹھائی تو اس کے کانپتے ہاتھ سے چھوٹ کر گلاس زمین پر گر گیا......کانچ کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔

اس نے بڑی ندامت کے ساتھ ہماری طرف دیکھا۔

''سوری — میرے گھر میں ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔''

''کوئی بات نہیں کانچ کا گلاس تھا۔ آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔'' نائیک نے ہنس کر کہا۔

''ہاں — میرے ہاتھ سے ہر چیز چھوٹ جاتی ہے۔ بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ بکھر جانے کا......'' شیشہ ٹوٹنے کی آواز سن کر ایک نوکر اندر آیا۔ اس نے گلاس کے بکھرے ہوئے ٹکڑے سمیٹے فرش صاف کیا تو ڈاکٹر نائیک نے کہا......

''آپ کو ایک دوست کی ضرورت ہے تو ہم سب دوستوں نے سوچا کہ اچھا ہے ایک اور دوست مل جائے۔''

''ایک اور — ؟'' اس نے بڑے طنز کے ساتھ مسکرا کے ہمیں دیکھا تو سب ہنس پڑے۔

''میں اردو کا ایک پروفیسر ہوں۔ ڈاکٹر امتیاز علی۔'' امتیاز نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

''میں ڈاکٹر نائیک۔ کارڈیالوجسٹ ہوں۔''

''میں سدرن سنگھ بیرسٹر ہوں — ''

''میں رمیش چندر۔ ڈی۔ جی آئی۔ پولیس — لیکن مجھ سے دور مت بھاگیے۔ میں اپنا ڈریس اتار کر آتا ہوں۔''

''میں راشد نیازی— '' راشد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ کچھ نہیں کرتے۔صرف شاعری کرتے ہیں۔'' امتیاز نے ہنس کر کہا— آپ کو ان سے بچ کر رہنا ہوگا ورنہ وہ فوراً اپنی نئی غزل سنانا شروع کردیں گے— ''سب نے مل کر زوردار قہقہے لگائے۔

''شاید راشد ہی دنیا کا سب سے اچھا کام کرتے ہیں— ٹوٹنے بکھرنے کے اس شعور میں پیار اور امن کی پناہ تو ان کی غزل ہی میں ملے گی۔ یا میرا کے گیتوں میں۔'' شیام نے راشد سے ہاتھ ملا کر کہا اور سب نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا کہ جیسے کہہ رہے ہوں ''یہ بُرا آدمی نہیں ہے۔''

''آپ سے مل کر اچھا لگ رہا ہے۔'' سورن سنگھ نے بڑی خوشی سے کہا۔

''ہمیں بھی آپ کے گھر آکر اچھا لگ رہا ہے۔'' امتیاز نے مسکرا کے کہا۔

''جی ہاں— اس گھر میں آکر ہمیشہ اچھا لگتا ہے جو اپنا نہ ہو— '' اس نے بڑی لاپروائی سے یہ بات کہی مگر راشد نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ جیسے اس نے سب کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

''پہلے ہم نے رات کو پروگرام بنایا تھا آپ سے ملنے کا خیال آیا کہ شاید رات میں آپ کی کوئی مصروفیت ہوگی۔''

''نہیں— آپ رات کو بھی آیئے۔ رات دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے لیے تو کبھی رات آتی ہے کبھی نہیں آتی۔'' اس نے سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر سورن سنگھ کو دیکھ کر رک گیا۔

''سوری'' اور پھر نوکر کو بلا کر چائے لانے کے لیے کہا۔

''بہت اچھی باتیں کرتے ہیں آپ۔'' رمیش نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں— صرف باتیں ہی اچھی کرتا ہوں۔''

''آپ ہمارے کلب کے ممبر بن جایئے۔ وہاں ہم شطرنج بھی کھیلتے ہیں۔''

''آئی ایم ویری سوری— مجھے کوئی کھیل نہیں آتا۔ ہر بازی ہار جاتا ہوں— '' اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بے بسی سے کہا— ''کیا کروں؟ ٹی۔ وی دیکھو تو مذہب، سائنس، سیاست کی

دہشت۔گھر سے ــــــ دنیا میں لوٹ...... نفرت کا اندھیرا...... میرے دل کو دھڑ کنے پر مجبور کر دیتی ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہیں آپ'' راشد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بچے مجھ سے دور چلے گئے ہیں۔دوستوں کو میرے ساتھ ہولی کھیلنا یاد نہیں رہتا۔بیوی کو اپنی محرومیاں اور میری حماقتیں یاد آتی ہیں۔صبح شام کی طرح اب ہم دونوں اکٹھے نہیں بیٹھتے کبھی۔''

''یہ تو ہر جگہ ہو رہا ہے۔اب دنیا سے پیار خلوص ختم ہو گیا ہے۔'' راشد نے کہا۔

''اب تو ہماری دنیا بھی ان تاریک سیاروں میں شامل ہو چکی ہے جہاں آکسیجن ہے نہ روشنی۔''

''آپ کی فیملی کہاں ہے۔گھر میں آپ کے ساتھ اور کون رہتا ہے؟''

سورن سنگھ چاہتا تھا اس ٹاپک کو بدل دے جس میں آکسیجن ہے نہ روشنی۔

''میرا بیٹا، رام کمپیوٹر انجینئر ہے...... وہ اپنے آفس کمپیوٹر کے آگے کان بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔نینا کی شادی ہو گئی۔وہ امریکہ چلی گئی ہے۔میری بیوی نرملا شیام بہت مشہور آرٹسٹ ہے۔''

''نرملا شیام؟ ہم سب چونک پڑے......'' وہ تو بہت مشہور آرٹسٹ ہیں۔وہ آپ کی بیوی ہیں؟

''جی ہاں...... وہ آج کل اپنے دوست راجن سنہا کے ساتھ کشمیر گئی ہیں۔وہ بھی بہت مشہور گائیک ہیں۔ان کی مدھر تانیں نرملا کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔''

''تو یہ نرملا شیام کا گھر ہے...... بہت اچھا لگا ہمیں آپ کے گھر آکر......'' امتیاز نے خوش ہو کر کہا۔

''آپ کا یہ پورٹریٹ بھی انہوں نے بنایا ہے؟''

''سب دیوار پر لگا شیام کا پورٹریٹ دیکھنے لگے۔''

''جی ہاں...... وہ کئی رنگوں کو ملا کر میرے من مانے روپ اجاگر کر دیتی ہیں۔'' شیام نے ہنس کر کہا۔

''آپ دیکھیے۔اتنے خوبصورت فریم کے اندر ایک کیل سے باندھ کر کتنی اونچائی پر رکھ دیا ہے مجھے...... بہت بڑی فن کار ہے وہ......''

شیام کی بات سن کر سب چپ ہو گئے۔

''لیکن آپ یہ دیکھیے کہ ایک کیل سے بندھا ہوا اتنی اونچائی پر بیٹھا اس گھر کو دیکھ رہا ہوں میں، جو ایک تھیئٹر کا خالی ہال لگتا ہے جہاں سب اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلے گئے۔''

''شیام صاحب! آپ کی باتیں سن کر ایسا لگتا ہے جیسے آپ بہت اچھے شاعر ہیں۔''

راشد کی بات پر سب ہنس پڑے......

''نہیں راشد صاحب۔ ہم......لوگ نہ شاعری کرتے ہیں نہ جی بھر کے ہنسنا آتا ہے۔ شک، مصلحت اور احتیاط کے حصار میں قید رہتے ہیں۔ لائیٹر جلا کر دنیا کے ہر مسئلے کو دیکھتے ہیں اور اپنی محرومی کو راکھ بنا کر جھٹک دیتے ہیں۔''

''واہ کتنی اچھی بات کہی ہے آپ نے۔'' امتیاز نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ لیا۔

''آپ جینئس لوگ ہیں۔ میں کوئی ایسی بات نہ کہہ دوں جو آپ کی بری لگے۔''

''ارے نہیں یار......آپ ہم سے بات کرتے وقت کیوں ڈر رہے ہیں؟'' سورن سنگھ نے ہنس کر کہا۔

''نہیں......مجھے اپنے سوا کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ غصہ آجائے تو میں پھر اپنی دھجیاں بکھیر کے پھینک دیتا ہوں۔

اور پھر کچھ مل جانے کی امید لیے خالی گھر میں گھومتا پھرتا ہوں۔''

''تو اصل مسئلہ آپ کی تنہائی کا ہے......؟ ڈاکٹر نائیک نے شیام کی بیماری سمجھ لی۔

''مجھے جانے کتنے روگ ہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں تو کسی کہانی کا ادھورا کردار ہوں جسے کوئی لکھ کر کاٹ دیتا ہے۔''

''اس لیے آپ کو ایک دوست کی ضرورت ہے۔''

اب آپ کو پانچ دوست مل گئے ہیں......'' سورن سنگھ نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔''

''ہم آپ کو تنہائی میں گھبرا کنے کے لیے اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔'' راشد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہاں یار۔ تم اس گھر میں اکیلے ہو۔ وقت کیسے گزارتے ہو؟''

''وقت کب رُکتا ہے! وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔ میں تو شلف کھول کر گزرے ہوئے وقت

کو ڈھونڈ تا ہوں۔''

''گزرے ہوئے وقت کو ہم بھی ڈھونڈتے ہیں۔'' راشد نے بڑی اداسی سے کہا۔

''مگر وہ وقت کہاں ملتا ہے......''

''مل بھی جاتا ہے'' شیام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' اگر کسی نے اپنی یادوں میں باندھ رکھا ہو۔''

وہ سب چُپ ہو گئے۔ جیسے اب کچھ بھی کہنے کو نہ رہا ہو۔

بعد میں امتیاز نے پوچھا...... ''ہم سب کے آ جانے سے آپ کو کیسا لگا؟''

''بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''گھر کی ہر چیز ویسی ہی لگ رہی ہے جیسی وہ ہے۔''

اس کی بات سن کر پھر سب چپ ہو گئے۔

''معاف کرنا شیام، اگر میں یہ پوچھوں کہ کیا آپ بھگوان کو مانتے ہیں!'' رمیش چاہتا تھا اسے دھرم ایمان کی طرف لے جائے۔

''ہاں......اس نے گردن جھکا کر دھیرے سے کہا۔'' میں بھگوان کو اس لیے مانتا ہوں کہ اپنی ہر محرومی ناکامی، بے ایمانی کا ذمہ دار اسی کو بنا دیتا ہوں۔''

''اچھا۔ تو آپ بھگوان سے نہیں ڈرتے؟''

''نہیں...... مجھے اپنے سوا کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ دوسروں سے بے ایمانی کر کے تو مزہ آتا ہے۔ مگر اپنے آپ سے بے ایمانی کرنے کا پاپ ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔'' وہ سر جھکا نے جیسے کسی عدالت میں بیان دے رہا تھا۔

''آپ سب میرے دوست بننا چاہتے ہیں تو اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے بہت سے قتل کیے ہیں۔ لوٹ، بے ایمانی کی ہے۔ اپنی بیوی نرملا سے جھوٹا پیار جتا کر۔ بچوں کو ادھر جانے سے روکا جدھر وہ جانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے بھی انصاف نہیں کیا۔ میرے خواب۔ میری خواہشیں۔ سب کا گلا گھونٹ دیا۔''

''آپ نے قتل بھی کیے ہیں؟'' وہ سب چونک پڑے۔

''ہاں......میں نے اپنی اس لگن کو مار ڈالا جو مجھے روشن سے من کی بات کہنے پر اکساتی

تھی۔ مگر میری خود پسندی نے دل کی بات کہنے نہیں دی۔ بعد میں اپنے دل کا حال اس کے نام خطوں میں لکھا اور وہ خط غالب کے دیوان میں چھپا دیئے۔ کئی بار روشن مجھ سے کچھ سننے کو آئی۔ میری جھکی جھکی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ کر پاکستان چلی گئی۔ جلد ہندوستان پاکستان کے بیچ مجھے روشن سے دور رکھنے کے لیے حد بندی کر دی گئی۔

''میں نے یہ گھر بنایا تھا کہ جب سارے سنسار میں جھوٹ، بے ایمانی، ناانصافی کا اندھیرا چھا جائے گا اپنے گھر کے چراغ سے سچائی اور پیار کی لو بڑھا دوں گا۔ مگر جھوٹ، بے ایمانی، خود غرضی کی آندھی میں وہ سارے چراغ بجھ گئے ہیں...... میرے ہاتھوں سے ہر چیز گر کے ٹوٹ چکی ہے۔''

اس کی بات سن کر کچھ دیر تک سب چپ ہو گئے...... پھر رمیش نے اسے سمجھایا۔

''ہاں یار...... زندگی میں ہم سب کچھ ایسے کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو کرنا نہیں چاہتے۔''

''تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اتنے دکھی کیوں ہو گئے ہو؟'' راشد نے قریب جا کر بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

''آپ انہیں چھوٹی چھوٹی باتیں کہتے ہیں؟'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''میں آرکیٹکٹ تھا...... اتنے ڈیم بنائے...... لاکھوں روپے کا ہیر پھیر کیا...... خراب کنسٹریکشن کی وجہ سے وہ پُل ٹوٹ گیا...... دو مزدور دب کر مر گئے۔''

''ایسی غلطیاں ہم سب کرتے ہیں۔ ان باتوں کو بھول کر اپنے آپ کو سنبھالیے آپ......''

ڈاکٹر نائیک نے انہیں غور سے دیکھا۔

''کل آپ ہمارے کلینک آیئے۔ میں آپ کا انجیوگرام کروں گا۔''

''نہیں نہیں......'' وہ گھبرا گیا...... ''آپ کیا کریں گے میرے دل کا جان کر؟'' سب ہنس پڑے......

''میں تو اپنے دل کا حال اپنے آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔''

کچھ دیر کے بعد پھر سب جیسے چپ ہو گئے اور پھر وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔

''آپ سب شاید یہ سُن کر ہنسیں گے کہ میں نے نیوز پیپر میں یہ اشتہار اس لیے دیا تھا کہ کال بیل کی آواز سن کر میں دروازہ کھولوں تو سامنے میں کھڑا ہوں......''

اور پھر بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے جیسے کسی سے سرگوشی کرنے لگا۔

''یہ کیسی اَن ہونی بات ہوگی کہ میں اپنے گناہوں، اپنی خودسری کو معاف کر کے اپنے آپ سے ہاتھ ملانے کو تیار ہو جاؤں؟''

☆☆

درشن کب دوگے ——؟

درشن کب دوگے بولو شیام!

ساتھ منزلوں والی بلڈنگ کے نیچے والے مندر میں بھجن گایا جارہا ہے۔

ڈھول کی تھاپ پر جھانجھر کی جھناجھن ...... کی جھنکار۔ عورتوں مردوں کے بے سُری آوازیں۔

درشن کب دوگے —— بولو شیام —— ؟

مگر ان کی آوازیں باہر سڑک کے شور میں ڈوب گئی ہیں۔

مارو۔ مارو۔ جلادو۔ توڑدو۔ باہر کے اس شور کو دبانے کے لیے مرد زور زور سے چلاتے ہیں۔

درشن کب دوگے۔ بولو نا! —— عورتیں سارے مندر میں اگربتیوں کی دھونی پھیلا دیتی ہیں کہ لاشوں کے جلنے کی بو بھگوان کے مندر میں نہ پھیلے۔

مندر میں —— ! کون سے مندر میں؟ ارے ہر مندر میں —— ایک زمانے میں تو ہر مندر میں بھگوان ہوتے تھے جو پکارنے والے کے پاس ضرور پہنچ جاتے۔ یہ جو ہر اونچے پربت پر ایک مندر نظر آتا ہے یہ سب اسی وقت بنائے گئے تھے جب ہر روز صبح کی پہلی کرن بن کر بھگوان اپنے پکارنے والوں کو درشن دیا کرتے تھے۔

اوم نمو بھگوتے دسودیودا

اوم سری وینکٹا سیوا نموبا

اوم نمو نرائینا نمو سوانہا

لوگ خوش ہو کر چلاتے۔ ناچتے گاتے۔ لوگ چلا رہے ہیں۔ پکار رہے ہیں۔ درشن کب دوگے —— جاگو موہن پیارے —— آنکھیں کھول کر دیکھو نا کہ سڑکوں پر کیسی ہاہاکار مچی ہے۔

دنیا کے راونوں نے ساری دنیا کو پھونک دیا ہے۔لوگ پناہ کے لئے چاروں طرف دوڑ رہے ہیں۔ سڑکوں پر بھاگ رہے ہیں۔

مارو۔مارو۔جلادو۔توڑدو

لوگ۔؟ کون لوگ——؟

ارے وہی لوگ جو روز سڑکوں پر فائرنگ کی زد میں آتے ہیں۔قتل کر دیئے جاتے ہیں۔جنہیں مذہب کے نام پر مارنا،اقتدار کے نام پر پھانسی دینا اور قانون کے نام پر کچل دینا جائز سمجھا جاتا ہے۔پھران بیچارے عوام کے لئے فنڈ جمع کرنے کی خاطر مسز راشد کو بڑے اہتمام سے میک اپ کرنا پڑتا ہے۔پبلک میٹنگوں میں جانا پڑتا ہے۔بڑے بڑے سرمایہ داروں کو رجھانے کے لئے سوسو طرح کے جتن کرنا پڑتے ہیں مسز راشد کو——

مسز راشد——! کون مسز راشد۔؟

اونہہ——ارے وہی مسز راشد جو ہمیشہ شہر کی سب سے خوبصورت بلڈنگ کے سب سے شاندار فلیٹ میں رہتی ہیں۔وہ اپنی کالونی کی مخالف فرقہ وارانہ کمیٹی کی ممبر ہیں۔بہت بڑے بزنس مین کی بیوی ہیں اس لئے جب شہر میں فساد کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو وہ بڑے سلیقے کے ساتھ میک اپ کرکے،بہترین ساری پہن کر فنڈ اکٹھا کرنے نکلتی ہیں تاکہ ٹی۔وی رپورٹ میں ان کا کلوزاپ اچھا لگے۔مگر گذشتہ فساد میں ایک شراب کے بیوپاری کی بیوی نے سب سے زیادہ چندہ اکٹھا کیا اور اس کا نام مسز راشد سے اوپر چلا گیا۔یہ دیکھ کر مسز راشد کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔

''اچھا اب کی بار فساد ہوا تو انشاء اللہ اتنا فنڈ اکٹھا کروں گی کہ ٹی۔وی پر پرائم منسٹر کے ساتھ مسکراتی نظر آؤں۔

لو——شہر میں کرفیو لگ گیا۔راشد صاحب اتنے بارسوخ آدمی ہیں کہ ایک کالونی کیا،وہ تو پورے شہر میں آگ لگا سکتے ہیں۔

کرفیو——کیسا رومانٹک لفظ لگتا ہے مسز راشد کو——جب فساد میں جلنے والوں کی بو چاروں طرف پھیلتی ہے تو مسز راشد کو روسٹ چکن یاد آتا ہے،جو وہ کرفیو کی وجہ سے نہیں کھا سکیں گی۔گھر میں خوب چہل پہل ہو جاتی ہے۔اسکول آفس بند ہیں۔سب دوست اکٹھے ہوں تو رمی کی پارٹی جمتی ہے۔وہسکی کے دور——ساتھ میں دنگے فساد پر رننگ کمنٹری——سنا آپ نے۔

کالونی میں دو بچوں کا قتل ہو گیا— ہاہاہا— شو— ارے یار آج تو قسمت ہی ساتھ چھوڑ رہی ہے— یہ لو— چلو نکالو سو روپے— یار آج بہت لوگ مارے جا رہے ہیں۔ اپنا تو موڈ تباہ ہو رہا ہے۔ بھابی دیکھنا اب فریج میں کوئی اور بیئر کی بوتل ہے—!

ایسے وقت رنگ میں بھنگ ڈالنے حسن بانو چڑیل ضرور آ جاتی ہے۔

حسن بانو—! کون حسن بانو؟

ارے وہی پڑوسن حسن بانو جو کسی کالج میں ہسٹری پڑھاتی ہے۔ شوہر شاعر ہے غنڈوں بیروزگاروں کے دوست ہیں دونوں گندے اول جلول ادیبوں شاعروں سے گھر بھرا رہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی ہر وقت کتاب آنکھوں سے لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر دنیا کے ہر دکھ پر چیخنے چلانے کو تیار ہیں۔

''دہریہ ہیں۔ مذہب کو نہیں مانتے دوزخی۔'' مسز راشد اپنے پڑوسیوں کو سناتی ہیں۔

''ہمارا فون خراب ہو گیا ہے۔ ذرا انترہ کو فون کر لوں۔ آپ نے سنا آج کالونی میں کتنے قتل ہوئے ہیں۔! حسن بانو کی سانس پھولی ہوتی ہے۔ آنکھیں بھیگی ہوتی ہیں۔ بال بکھرائے، میکسی پہنے۔ جیسے سارے مرنے والے ان کے رشتے دار تھے۔

''چائے پی لیجیے۔'' انہیں دیکھ کر راشد گھبرا گیا۔ دوستوں کے ساتھ رمی کھیلنا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی جلدی بوتلیں اور گلاس ادھر ادھر چھپائے۔ وہ اس دو ٹکے کی لیکچرر سے اتنا کیوں ڈرتا ہے؟ مسز راشد کو اس بات پر بڑا غصہ آتا ہے۔ اس سانولی سی عورت میں ایسی کیا بات ہے کہ راشد کارڈز پٹخ کر اس کے پاس آ بیٹھے!

حسن بانو تھکی ہوئی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ بکھرے بالوں کا جھنڈ دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلا۔ اتنی دیر میں راشد سگریٹ کاٹن لے آئے اور حسن بانو کو سگریٹ آفر کرنے کے بعد اسے سلگانے کے لئے اس کی طرف جھکے۔

''زہر لگتی ہیں مجھے! سموکنگ کرنے والیاں''۔ مسز راشد نے کڑوا سا منہ بنایا۔

''پھر دنگے شروع ہو گئے۔ سنا ہے اس بار بڑا پلان کر کے لڑائی شروع کی ہے۔'' حسن بانو نے سگریٹ کا کش لے کر آہستہ سے کہا۔

''اور ہمارے گھر میں مٹن ہے نہ بٹر۔ اب تو وہسکی بھی ختم ہو گئی۔'' مسز راشد بھی وہیں

آ بیٹھیں۔

''جی۔آپ کے بھی کیا کیا پرابلمس ہیں بھابی''۔ حسن بانو نے بڑی ہمدردی کے ساتھ انہیں دیکھا۔

''بات یہ ہے راشد صاحب—'' وہ راشد کی طرف مڑ گئی۔

''کہ خدا تک پہنچنے کے لئے اب مذہب ہی سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے اب ہم خدا کے نام پر مذہب کے تقدس سے کھیل رہے ہیں۔''

''توبہ توبہ۔یہ تو کفر ہے کفر—'' مسز راشد نے اپنے گالوں پر تھپڑ مارے۔

''ارے یہ لڑائی جھگڑے تو کوئی شریف آدمی تھوڑی کرتے ہیں۔یہ تو سب غنڈے کرتے ہیں سڑکوں پر گھومنے والے۔''

''شریف آدمی سے آپ کا مطلب ہے امیر آدمی''! حسن بانو نے مسز راشد کی طرف دیکھا۔

''ہاں،آپ ٹھیک کہتی ہیں بھابی۔شریف لوگ خود نہیں لڑتے۔مگر انہیں مرغ اور بٹیر کی لڑائی دیکھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔''

''درشن کب دو گے۔بولو نا—؟

پڑوس کا ٹرانزسٹر چلاتا ہے۔

''شیام۔او شیام۔اندر آ بیٹا''۔بھجن سن کر شیام کی ماں گھبرا گئی۔شہر میں فساد ہو رہا ہے اور یہ شیام گھر سے باہر—

''تجھ سے کتنی بار کہا ہے میں نے—شہر میں دنگے ہو رہے ہیں۔مسلمانوں کے گھر میں مت جا''۔

''مگر میں تو اپنے دوست طاہر کے گھر میں کھیل رہا تھا ماں''—

شیام کی ماں۔!کون شیام کی ماں؟

ارے وہی شیام کی ماں،جو ہر گلی،ہر بس میں،ہر کالونی میں کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتی ہے۔سب کو شک بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی۔وہ پر کا کوا بنانے کا فن جانتی ہے۔وحشتناک خبروں میں کلیاں پھندنے ٹانکنا اس کا فرض ہے۔اپنے پوتر بدن کو ساری دنیا کی گندگی سے بچاتی پھرتی ہے۔

''ملیچھوں نے دھرم کا ناش کر دیا ہے اب۔ہریجن ہو کر مندر میں گھس آتے ہیں۔

مسلمان ہو کر ہم سے برابر کا دعوی کرتے ہیں۔اری بہن کلجگ آ گیا ہے۔سنسار میں۔ ہے بھگوان! تو انہیں اٹھا لے سنسار سے بھگوان۔او بھگوان! درشن کب دو گے۔ بولو نا!

لوگ چلا رہے ہیں۔بھگوان کو پکارتے پکارتے پجاری کا حلق سوکھ گیا ہے۔

پجاری۔؟ کونسا پجاری؟

ارے وہی پجاری جو مندر کے دروازے پر کھڑا دیکھ رہا ہے کہ آنے والا ہریجن ہے یا برہمن۔منسٹر ہے یا بھکاری۔پھر وہ حکم دیتا ہے کہ لائن بنا کر آؤ۔

تم کونسی لائن میں کھڑے ہو کر بھگوان کے درشن چاہتے ہو۔یہ سو روپے والی لائن ہے۔ یہاں تم بہت جلد بھگوان کے درشن کر لو گے۔یہ دس روپے والی لائن ہے۔یہاں بھگوان اپنے پکارنے والوں کے پاس سات گھنٹے بعد بھی آ سکتے ہیں۔

بولو — بولو نا شیام — درشن کب دو گے!

لوگ باہر چلا رہے ہیں۔

اوم نمو نرائینا نمو سیوا نہا نمشوایا

اور بھگوان چپ ہیں۔پجاری غصہ میں آنکھیں نکال کر کہتا ہے۔

"بھگوان تم لوگوں سے روٹھ گئے ہیں۔جاؤ بھاگ جاؤ۔بھاگو — بھاگو مارو — توڑ دو۔جلا دو۔

بوڑھے مرد، بے بس عورتیں، چھوٹے چھوٹے بچے، مکئی کے دانوں کی طرح آگ میں بھن رہے ہیں۔چیخ رہے ہیں۔ننھے بچوں کی چیخ پکار سے ساری بستی گونج رہی ہے۔

بچے — ! کون سے بچے — ؟

ارے وہی بچے جن کی قسمت میں اللہ میاں نے عذاب سہنا لکھا ہے، جو فرعون کے زمانے میں دریا میں بہائے جاتے تھے۔کنس کے دور میں قتل کئے جاتے اور آج کے دور میں آگ میں جھونکے جا رہے ہیں۔وہ کہیں جائیں۔ان کے لئے پناہ نہیں ہے۔انہیں پیدا ہونے کے جرم کی سزا ضرور ملے گی۔پھانسی کا پھندا۔بس کا پیالہ — بندوق کی گولی ہر بچے کا مقدر ہے۔

جھن جھنا جھن — مندروں میں زور زور سے بھجن گائے جا رہے ہیں۔

درشن کب دو گے بولو نا۔شیام شیام شیام — میرا کے پربھو گردھر نا گر دو سرو نہ کوئے۔

کون گلی گیو شیام بتا دے کوئی۔

میرا — ! کونسی میرا — ؟

ارے وہی میرا جو ڈاکٹر گردھر گوپال کی دیوانی ہے۔ سنا ہے دونوں بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ وہی میرا جو سنگیت کلا اکیڈمی میں سنگیت سیکھنے روز بس سے جاتی ہے۔

میرے تو گردھر گوپالا دوسر و نہ کوئے۔

کتابیں سینے سے لگائے۔ کاندھے پر جھولا ڈالے۔ وہ بس میں اپنی سہیلیوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔

''آج ہمارے کالج میں کچھ لوگ کسی درگاہ کے عرس کا چندہ مانگنے آئے تھے۔ میں نے انہیں خوب ڈانٹا۔'' اس کی سہیلی سر میں کہہ رہی تھی جو سنگیت کلا اکیڈمی میں ناچ سیکھنے جاتی ہے۔

''اچھا کیا۔ کچھ لوگوں نے اسے بھی اپنا بزنس بنالیا ہے۔ بھئی ہر تیوہار پر شہر میں فساد۔ آج کل تو ہر تیوھار دوسروں کی موت کا پیغام بن کر آتا ہے۔

''توبہ توبہ کیا کفر بک رہی ہے یہ لڑکی۔ مسلمان ہو کر پیروں مرشدوں کی توہین کرتی ہے۔''

بس میں بیٹھے ہوئے ایک مولوی صاحب اپنے گاؤں پر تھپٹر مارتے ہیں۔

''مولوی صاحب — کون مولوی صاحب؟

ارے وہی مولوی صاحب جو اپنے سوا ہر انسان کو دوزخ میں بھجوانے کا انتظام کر چکے ہیں۔ جنہوں نے مذہب کو ہوّا بنا رکھا ہے۔ ناسمجھ لوگوں کو، چھوٹے بچوں کو دوزخ کے عذاب سے، خدا کے قہر سے، سانپ بچھوؤں سے اتنا ڈرا چکے ہیں کہ اب مسجدیں خالی نظر آتی ہیں — ہر طرف ایک ہی آواز گونج رہی ہے۔ مارو۔ مارو۔ بھاگو۔ بھاگو۔ جلا دو۔

دیرے نانا تا دیر تانا توم

تا دانا نا دیر تا دتوم۔ دیم۔ دیم توم۔ نادے دا تا دوم —

میرا جے جے ونتی کا ترانا گنگنا رہی ہے۔

ناستک ہیں یہ سالیاں۔ چلو یار آج اسے بھگوان کے درشن کرا دیں۔

اور گھور اندھیاری میں میرا چلاتی رہی — نیناں مورے ...... اور — کیوں لیو مکھ موڑ سجنوا۔؟ مگر پھن اٹھائے ہوئے ناگ آج پھولوں کا ہار نہیں بنا اور بس کا پیالہ پیکر میرا ہنسنے کی

بجائے کسی گٹر میں پڑی کراہتی رہی۔ اس کا ٹوٹا ہوا اکتارہ اوندھا پڑا تھا اور لوگ جے جے ونتی کے کومل سروں کو روندتے ہوئے بھاگ رہے تھے — چلا رہے تھے — مارو۔ مارو۔ جلا دو۔ توڑ دو۔

درشن کب دو گے۔ بولو شیام —؟

''ممی! کیا بھگوان اس مندر سے چلے گئے ہیں، وہ جواب کیوں نہیں دیتے!'' ایک بچہ انتظار سے اکتا کر اپنی ماں سے پوچھتا ہے۔

ایسا لگتا ہے اس مندر میں بھگوان آتے ہی نہیں۔ اس کی ماں نے سوچا، جو کسی کالج میں لڑکیوں کو فلاسفی پڑھاتی ہے۔ شاید اب بھگوان کو پکارنے والوں کے دلوں میں وہ پیار نہیں ہے جو ......کو بھگوان کے روپ میں ڈھال دیتا تھا۔ اس لئے لوگ کب سے چلا رہے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ بڑی بے قراری سے بھگوان کے درشن کا منتظر ہے۔ میں اسے کیسے بتاؤں کہ اب کوئی اوتار اس گندی دھرتی پر نہیں اترے گا جہاں لوگ دس اور پانچ روپے دے کر لائن بنائے کھڑے ہیں اور چلا رہے ہیں۔

درشن کب دو گے۔ بولو شیام —؟

مگر ان کی آوازیں مارنے اور جلانے والون کے شور میں ڈوب جاتی ہیں۔

☆☆

کل رات ہمارے گھر
مرزا غالب اور عصمت چغتائی آئے تھے

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر ایک بات۔

میں سچ مچ غالب کو کوس رہی تھی۔

کمبخت جانے کتنی الجھنوں میں ڈال دیتا ہے۔

غالب کی شاعری میں عورت کا تصوّر۔

سیمینار کے لئے پیپر لکھنا تھا مجھے۔

غالب کی شاعری.....اُف.....کہاں تک سوچو.....؟ کیا لکھو.....؟

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے۔

اب پھنس گئے.....نکلنے کا راستہ کہاں ہے.....؟

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب.....؟

میں نے ''دیوانِ غالب'' بند کیا۔ ٹیبل لیمپ آف کیا۔ منہ پر رضائی ڈال لی۔

دروازے پر بیل کی آواز سن کر چونک پڑی۔

کون ہے.....میں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا۔

اتنی بارش ہو رہی ہے۔ آدھی رات کو کون آیا ہے؟

سفید داڑھی والا ایک اونچا سا بوڑھا اور ایک موٹی سی عورت۔

دونوں کسی بات پر زور زور سے بول رہے تھے۔

کوئی مہمان ہیں؟ یا چور ہیں؟ بھکاری ہیں؟

''آپ کون ہیں.....؟ کیوں آئے ہیں.....؟''

''بانو...... جلدی سے دروازہ کھول، ہم بھیگ رہے ہیں۔''

''جانے کون عورت ہے۔ آواز سنی ہوئی سی لگتی ہے۔''

میں نے دروازہ کھول دیا۔

لمبی سی ٹوپی اوڑھے ایک اونچا پورا بوڑھا آدمی تھا۔ اور ایک موٹی سی بوڑھی عورت۔ بالکل عصمت چغتائی جیسی لگ رہی تھی۔

''بانو''۔ اس نے مجھے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا اور پھر غصہ میں بولیں۔

''تیرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں کیا؟ اتنی دیر لگاتی ہے دروازہ کھولنے میں۔''

اب میں نے غور سے دیکھا۔

''آپ...... ؟ آپ...... عصمت آپا...... ؟'' میں خوشی کے مارے ان سے لپٹ گئی۔

میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اب عصمت چغتائی کو دیکھوں گی۔

''آپ یہاں کیسے آ گئیں...... ؟ اور آپ...... ؟ آداب......''

میں نے ان صاحب کو جھک کر سلام کیا اور ان کی طرف غور سے دیکھا۔

''معاف کیجئے...... میں نے آپ کو نہیں پہچانا...... بیٹھئے نا......''۔

''بی بی...... مجھے بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے......''۔ انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

''بانو...... یہ میرزا غالب ہیں...... تو ان کے بہت گن گاتی ہے نا......''۔

''میرزا غالب...... ہمارے گھر آئے ہیں...... ؟'' میں لڑکھڑا گئی۔ عصمت آپا کی بات پر یقین نہیں آیا...... غور سے ان کی طرف دیکھا۔ شاید اسٹیج کا کوئی ایکٹر ہے۔ میک اَپ بہت اچھا کیا ہے۔ بالکل غالب ہی لگ رہا ہے۔

''تو گھبرا گئی...... ؟'' عصمت آپا ہنسنے لگیں۔

''یہ سچ مچ کے میرزا غالب ہیں۔''

''سچ مچ کے؟''...... میرا سر چکرانے لگا۔

''پانی لاؤں آپ کے لئے......'' میں خود پانی پی کر ہوش میں آنا چاہتی تھی۔

''بانو کے گھر میں صرف پانی ملے گا......'' عصمت آپا نے منہ بنا کر میرزا غالب کو دیکھا۔ وہ گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھے جا رہے تھے۔ جیسے یہاں سے جانا چاہتے ہوں۔

تو کیا یہ سچ مچ کے میرزا غالب ہیں؟ اور وہ عصمت چغتائی!

مگر بانو کھانا بڑے مزے کا بناتی ہے۔ آج تو نے کیا بنایا تھا۔ کھٹی دال...... چاول......؟''

گلاس میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ میں خود بھی کانپ رہی تھی۔

''دروازہ بند کر دو۔ کوئی ہمیں یہاں نہ دیکھ نہ لے۔'' عصمت آپا نے مجھ سے کہا۔

''آپ دونوں کہاں تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم دونوں جنت سے نکل بھاگے ہیں۔ اسد اللہ خاں تو ایسی جگہ جانا چاہتے تھے جہاں کوئی نہ ہو۔ مگر بارش شروع ہو گئی۔ تیرا گھر نظر آیا تو یہاں آ گئے۔''

عصمت آپا ڈائننگ ٹیبل سے انگور کی پلیٹ اٹھا لائیں اور غالب کے آگے رکھ دی۔

''جنت سے......؟ آپ دونوں جنت میں تھے......؟''

میں نے تعجب سے پوچھا۔

''اور کیا......؟'' عصمت آپا انگور کھانے لگیں۔ ''مزے کر رہے ہیں وہاں اسد اللہ خاں ......ستر حوروں کو گھیرے رہتے ہیں۔ شراب طہور میں غرق اور خس اور عنبر کی نہروں میں نہاتے ہیں۔ ابھی تک ان کے کپڑوں سے وہی خوشبو آ رہی ہے۔ میرا سر چکراتا ہے اس خوشبو سے۔'' عصمت آپا نے ناک پر ہاتھ رکھ کر منہ پھیر لیا۔

''اچھا......!'' میں حیران ہو کر غالب کو دیکھ رہی تھی۔ بہت اداس، سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔

''مگر آپ دونوں جنت میں...... میرا مطلب ہے...... کیسے...... کیسے......؟''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...... کیا کہوں؟

''ہم بھی حیران تھے جب جنت کے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے گئے۔''

عصمت آپا نے مجھے سمجھایا۔

''ہم تو جنت کی حقیقت سے واقف تھے۔'' میرزا غالب نے آہستہ سے کہا اور وہ میر صاحب تو دوزخ میں سب کو یہی دکھڑا سناتے پھر رہے ہیں:

قیامت کو جرمانہ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

''اسی لئے زندگی میں وہ کام کیا جو ہمیں جنت کی طرف نہ لے جائے۔''

غالب نے اداس ہو کر کہا۔

''ان کے سب دوست دوزخ میں ڈالے گئے۔ مگر یہ بیچارے اکیلے جنت میں تڑپ رہے تھے۔''

عصمت آپا نے بڑی ہمدردی سے غالب کی طرف دیکھا، جو پانی ایسے پی رہے تھے جیسے......رات کے وقت مے پیتے، ساتھ رقیب کو لئے......

مگر بچارے کو ساتھ ملا عصمت چغتائی کا......

''مگر آپ کو تو لوگ جلتی چتا میں جھونک آئے تھے۔ دوزخ کی طرف پہنچا دیا تھا......'' میں نے عصمت آپا سے کہا۔ آپ نے تو جنت کے خواب بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔''

''تو خواب کی بات کر رہی ہے بانو......میں بھی جنت میں ہوں۔''

''کیا......؟ آپ جنت میں ہیں......؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں......وہیں سے تو اسداللہ خاں کو ساتھ لے کر آرہی ہوں۔'' عصمت آپا نے ہنس کر کہا۔

''اچھا......؟ تو آج پھر۔ حوا کے بعد ایک مرد کو۔ میرا مطلب ہے میرزا غالب کو عصمت چغتائی جنت سے نکال کر زمین پر لے آئیں......؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''اے ہٹ......میں کیوں لاتی......! وہ جو راجہ مہدی علی خان ہیں۔ وہ مولوی ملاؤں کے ساتھ دوزخ کی دیواروں پر چڑھ کر جنت کی حوروں کو تاکتے ہیں نا۔ ہم دونوں نے ان کی خوشامد کی تو انہوں نے ہمارا ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اور جنت سے نکال کر زمین پر پٹک دیا''۔

''مگر آپ دونوں جنت میں کیسے پہنچ گئے......؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''میں تو چلاتا رہا کہ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق۔'' غالب نے بڑی اداسی سے کہا۔ مگر منکر نکیر نہ مانے......میرے اعمال میں لکھ دیا کہ غالب کا کلام سننے کے بعد بہت شاعروں نے شاعری کرنے سے توبہ کرلی۔ اس طرح ان شاعروں کا کلام مشاعروں میں سننے کے عذاب سے غالب نے اتنے لوگوں کو بچایا ہے۔ اس لئے جنت کے دروازے اس پر کھول دیئے جائیں۔ غالب نے بڑی شرمندگی کے ساتھ کہا۔

''اور آپ......؟ آپ کیا فرشتوں کی غلطی سے جنت میں پہنچ گئیں......؟''میں نے عصمت آپا کی طرف دیکھا۔

''ارے مجھے تو اس کہانی ''لحاف'' نے جنت میں پہنچادیا ہے۔''عصمت آپا نے بڑی بیزارگی کے ساتھ کہا۔

''لحاف نے......؟''میں تعجب سے عصمت آپا کو دیکھنے لگی۔ بچاری اب سٹھیا گئی ہیں۔

''ہاں......اس کہانی پر دنیا میں بھی مجھے کورٹ کچہری میں گھسیٹا تھا......مرنے کے بعد بھی جانے اور کتنے گناہ میرے سر منڈھ دیئے گئے۔ مجھے دوزخ کی طرف لے جا رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ''لحاف'' پر پڑی اور پھر فیصلہ ہوا کہ یہ تو جنت میں جائے گی۔''عصمت آپا بڑی اداسی کے ساتھ کہے جا رہی تھیں۔

''مگر کیوں......؟''میں نے تعجب سے کہا۔''لحاف''تو......''لحاف''میں تو......آپ نے......''اب میں مرزا غالب کے سامنے کیا کہتی کہ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد ملاؤں، مولویوں اور نقادوں نے کتنا شور مچایا تھا۔ عصمت چغتائی کو کورٹ تک جانا پڑا تھا۔

''وہ جو لحاف میں چھپے رہتے تھے عصمت نے ان پر سے لحاف اٹھا دیا۔ یہ کام کوئی اور نہیں کر سکا۔ اس لئے جنت کے دروازے عصمت چغتائی کے لئے کھول دیئے گئے۔''مرزا غالب نے مسکرا کے کہا۔

''سچ مچ......؟''میں عصمت آپا سے لپٹ گئی۔

''جنت میں کتنا مزہ آرہا ہوگا آپ کو۔''

''کچھ مزہ نہیں آتا وہاں۔ میں تو دوزخ کی طرف جانا چاہتی تھی۔ مگر راستے میں اسد اللہ خاں مل گئے۔ سارے ادیب، شاعر، دوست، سب دوزخ میں دھوم مچا رہے ہیں۔''

''مگر کیوں؟ آپ جنت سے دوزخ کی طرف کیوں جانا چاہتی تھیں؟''میں نے تعجب سے پوچھا۔

''وہاں ہر طرف مولوی ۷۰ حوروں کو گھیرے موج منا رہے ہیں۔ شراب طہور میں مست۔ عورتوں کے لئے ۷۰ غلام ہیں نہ شراب طہور۔ میں نے شور مچایا تو کہا۔

''اچھا ہم شاہد لطیف کو بلا لیتے ہیں۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ مجھے دوزخ میں

سکون سے رہنے دو۔ بانو جنت تو صرف مرد کے لئے ہے۔ عورت کو نظر اٹھانے پر دوزخ ملتی ہے، نظر جھکانے پر شوہر......''۔

''عصمت چغتائی...... تم پھر افسانہ لکھنے بیٹھ گئیں۔'' مرزا غالب نے ہنس کر کہا۔

''اسد اللہ خاں! تم بتاؤ۔ مردوں کے لئے ''بہشتی زیور'' کیوں نہیں لکھی گئی؟''

عصمت آپا کو غصہ آ گیا۔

اس کتاب میں مرد کو حکم دیا جاتا کہ عورت سامنے آجائے تو اسے نظر اٹھا کر مت دیکھو، مگر تم شاعر لوگ تو عورت نظر آجائے تو غیرت قومی سے زمین میں گڑ جاتے ہو۔ تمہارے ایک اور شاعر دوست ہیں جنت میں، تم ان سے روز ملتے ہو گے! انہوں نے بھی عورت کو مغربی علوم پڑھانے کے عذاب سے ڈرایا تھا اور اس کے گلے میں زمرد کا گلوبند پہنا کر بیٹھا دیا تھا۔

عصمت آپا کو بہت غصہ آرہا تھا۔

''عصمت چغتائی تم ایک عورت ہو اس لئے......'' مرزا غالب نے عصمت آپا کو سمجھانا چاہا۔

مگر عصمت آپا کو بہت غصہ آچکا تھا۔

''اسد اللہ خاں...... مجھے بار بار یاد مت دلاؤ کہ میں عورت ہوں۔ اطمینان رکھو، میں عورت ہی رہوں گی۔ مرد ہر روپ میں ڈھل جاتا ہے، خدا، پیغمبر، دیوتا، راکشس، مگر عورت سچائی اور اچھائی کی کسی منزل پر پہنچ جائے وہ عورت ہی رہے گی۔''

''نہیں، وہ عصمت چغتائی بھی بن سکتی ہے۔'' مرزا غالب نے مسکرا کے کہا اور پھر عصمت آپا کا غصہ کم کرنے کو کہا:

''عورت کا رتبہ بہت بڑا ہے عصمت چغتائی، وہ ماں ہے، محبوبہ ہے، خدا کے بعد دنیا کو تخلیق کرنے والی ہے......''

''بس کرو اپنی شاعری۔'' عصمت چغتائی نے غصہ میں منہ پھیر لیا۔

''سارے قانون غلام اور عورت کے لئے بنائے گئے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ عورت کے آگے تین لکیریں کھینچ دی ہیں۔

''عصمت بی بی...... اب یہ بحث چھوڑو۔'' مرزا غالب بور ہو کر کرسی پر لیٹ گئے اور

مسکرا کے بولے۔

''اب ہمیں سچی بات بتادو۔تم کس شاعر کے عشق میں جنت سے دوزخ کی طرف جانا چاہتی ہو......؟''

''مجھے کسی شاعر سے عشق ہوگا......؟توبہ کرو......''عصمت آپا نے براسامنہ بنا کر کہا۔

''مگر آپ مرزاغالب کو تو بہت پسند کرتی تھیں۔ایک بار آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ غالب کی شاعری تو رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے......''میں نے عصمت آپا کو یاددلایا۔

''ہاں......انہیں پڑھنے کے بعد میں نے شاعری پڑھنا چھوڑ دی تھی۔لمبی کہانی کو ایک شعر میں سمو دینے کا فن انہیں آتا ہے۔''عصمت آپا نے مسکرا کے غالب کو دیکھا۔

''تو یہ فن آپ نے مرزاغالب سے سیکھا ہے......میں نے مسکرا کے کہا۔

''کچھ نہیں سیکھا......ان کی شاعری جس نے پڑھی وہ دونوں جہاں سے گیا۔

''اچھا......؟''تو اب پتہ چلا کہ مرزاغالب کی کشش ہی آپ کو ان کے ساتھ زمین پر پھر لے آئی___؟

''اے توبہ کرو بانو......ان شاعروں سے کوئی دل لگائے گا؟مجھے تو شاعروں کی صورت دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔''

عصمت آپا نے براسامنہ بنا کر مرزاغالب کو دیکھا،جو سر جھکائے انگور کھا رہے تھے۔

''یہ کون سے شاعر کی بات کر رہی ہو......؟''انہوں نے مسکرا کے پوچھا۔

عصمت آپا نے غور سے مرزاغالب کو دیکھا اور اپنی کرسی ان کے پاس لے آئیں۔

''اسداللہ خاں......تم اپنے ہر شعر میں معشوق کی بے وفائی کا دکھ سنا کر پڑھنے والوں کو رُلا دیتے ہو۔مگر آئینے میں کبھی اپنی شکل بھی دیکھی ہے......؟''

عصمت آپا کی بات سن کر میں گھبرا گئی۔انہیں مرزاغالب سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہئے۔

''گریباں چاک چھترے لگائے،ہاتھ پاؤں زخمی ،انجائنا،بلڈ پریشر اور دق کے مریض......نہ ہاتھوں میں جنبش نہ پاؤں میں چلنے کی طاقت۔''

غالب کو عصمت آپا کی باتوں پر ہنسی آرہی تھی۔

''بس...... ہماری برائیاں ختم ہوگئیں......؟'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''میں برائی نہیں کر رہی ہوں۔'' عصمت آپا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ تم خود ہی اپنا یہ حال سناتے ہو۔

بہرہ ہوں میں تو چاہئے دوہرا ہو التفات
اور مفلسی کا یہ عالم ہے کہ قرض کی پیتے تھے مے

''مگر ایک بات سنو عصمت چغتائی۔'' غالب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پہلے مجھے پوری بات کہنے دو۔'' عصمت آپا نے انہیں روک دیا۔

تمہارا دل ٹھکانے پر ہے نہ دماغ۔ محبوبہ کے گھر کا راستہ بھی دوسروں سے پوچھتے ہو کہ جاؤں کدھر کو میں؟ اس حال میں اپنی محبوبہ کے سامنے آ کر پھر اس بات کا شکوہ بھی کرتے ہو کہ...... در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کر کیسا پھر گیا......؟

اور پھر تمہیں غصہ دوسروں پہ آتا ہے...... ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں؟

بانو...... تو بتا کہ غالب کو اس حال پر پہنچانے میں بھلا دل شاہ جہاں پوری اور جگر مراد آبادی کا کیا قصور ہے......؟

میرے ساتھ مرزا غالب بھی عصمت آپا کی باتوں پر ہنسنے لگے۔

''تم نے ایک شعر اچھا کہا ہے اسد اللہ خاں''۔

چاہتے ہو خوبروؤں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

مرزا غالب کو عصمت آپا کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھے رہے تو عصمت آپا ان کے پاس آئیں اور بڑی محبت سے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''چلو...... ہم اقرار کئے لیتے ہیں کہ اسد اللہ خاں کا ساتھ ہوگیا تو جنت میں تھی میں۔ مگر جب وہ راجہ مہدی علی خاں کا ہاتھ تھام کر دنیا کی طرف جا رہے تھے تو میں نے سوچا...... اب جنت میں کیوں رہوں میں......؟

مرزا غالب کو بھی ہنسی آ گئی۔ انہوں نے بڑی محبت سے عصمت آپا کا ہاتھ تھام لیا۔

''بارش تھم گئی ہے، اب یہاں سے چلو۔ تم نے پہلے یہ بات کہی ہوتی تو جنت سے کیوں

بھاگتا میں......؟''

میں نے ان دونوں کا موڈ بدلنے کے لئے کہا۔

''اب میں آپ دونوں سے کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گی۔''

میں بڑے ادب کے ساتھ مرزا غالب کے آگے جھک گئی۔

''صبح جب میں کسی سے کہوں گی مرزا غالب اور عصمت چغتائی ہمارے گھر آئے تھے تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔اس لئے آپ دونوں دو ایک دن کے لئے یہاں رک جایئے۔انور بھی اب آتے ہوں گے۔ وہ تو حیران ہو جائیں گے کہ آپ دونوں اور ہمارے گھر آ گئے!

پھر دیکھئے......سب کو......میڈیا کو......ادبی حلقوں کو جب یہ بات معلوم ہوگی تو اردو کے سارے نقاد دوڑے ہوئے آئیں گے......آپ دونوں کو گھیر لیں گے۔''

''یہ تو کیا کہہ رہی ہے بانو......؟''عصمت آپا گھبرائیں۔

''اردو نقاد ہمیں گھیر لیں گے......؟''مرزا غالب بھی پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

''ہاں......''!میں نے خوش ہو کر کہا۔

''اَب آپ کی کہانی ''لحاف'' کو نقاد ترقی پسندی کی ڈوری میں باندھیں گے۔کوئی مابعد جدیدیت کے ''لحاف'' میں چھپادے گا......اور مرزا غالب کی شاعری میں ایک بار پھر معاشی، سیاسی، تاریخی، تہذیبی عناصر کا پتہ چلانے میں نقاد مصروف ہو جائیں گے۔عصمت چغتائی نے غالب کی شاعری کا ایک نیا پہلو نقادوں کو دیا ہے۔''

''نہیں نہیں۔ ہمارے آنے کی خبر نقادوں کو مت دینا بانو۔'' غالب نے گھبرا کے کہا۔

ہم تو دنیا سے اسی لئے بھاگے تھے کہ......پکڑے جاتے ہیں نقادوں کے لکھے پر ناحق۔''

عصمت آپا بھی گھبرا گئیں۔

''تم بہت کاہل ہو اسد اللہ خاں۔بس سوچتے رہے کہ......''

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا، کاش کہ مکاں اپنا

اب جلدی چلو......عرش سے پرے ہی کہیں پناہ ڈھونڈیں گے۔

عصمت آپا نے مرزا غالب کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں۔

’’ٹھہریے......ذرا میری ایک بات تو سنئے......‘‘۔

میں آنکھیں ملتی......بستر سے اٹھی......رضائی منہ پر سے ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

☆☆

گُلِ نغمہ

آفتاب احمد گاتے تھے:

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

''گلِ نغمہ کسے کہتے ہیں ممی......؟'' نگی سو بار کا دہرایا ہوا یہ سوال ایک بار ممی کے چہرے پر پھر بکھیر دیتی۔ ممی کی جھکی ہوئی آنکھوں میں ڈھونڈتی، ممی کی بے تاب انگلیوں سے کھیلنے لگتی، جو ہر وقت تان پورے پر جانے کس راگ کو ڈھونڈے جاتی ہیں۔

''میں کیا جانوں! آفتاب احمد کہتے تھے کسی راگ کو ساز پر ہم آہنگ کرنے کی جو کھوج ہے وہی گل نغمہ ہے......'' ادشا کہیں دور دیکھنے لگی۔

''تو پھر آپ نے میرا نام گل نغمہ کیوں کر رکھا......؟'' نگی یہ بات بار بار پوچھتی تھی۔

ادشا کو نگی کے اس سوال کا جواب نہیں دینا تھا۔ وہ تان پورے کو سر سے لگائے انگلیوں کو دھیرے دھیرے اس پر پھیرنے لگتی۔

''جب موہن نے آفتاب احمد کو تیری پیدائش کی خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ موہن سے کہا، اس لڑکی کا نام گل نغمہ رکھو......''

''کیوں......؟ آفتاب انکل نے مجھے گل نغمہ کیوں بنا دیا......؟''

نگی ادشا کے پاس آ بیٹھی اور تان پورے پر رکھے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا بھی ہاتھ رکھ دیا۔

ادشا نے گھبرا کے تان پورہ رکھ دیا اور اپنی بیٹی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کہیں دور چلی گئی تھی......

''شاید وہ جانتے تھے کہ تم ساز اور آواز کو ہم آہنگ کرنے کی کھوج ہو...... وہ مجھ سے بار بار کہتے تھے...... ڈھونڈو...... پکڑو...... وہ کہتے تھے...... وہ......''

ادشا کی باتیں سن کر نگی کی الجھن اور بڑھ جاتی تھی...... اس کے آگے جانے کتنے الجھے دھاگے...... دائرے...... سوال، چاروں طرف بکھر جاتے تھے......

شاید اسی لیے ممی کو میں نظر نہیں آتی......! وہ مجھے بار بار پکارے جاتی ہیں...... میں سامنے بیٹھی ہوں مگر سارے گھر میں ڈھونڈتی پھرتی ہیں...... اور پھر وہ تان پورہ اٹھا کر ایک جگہ بیٹھ جاتی ہیں۔ آنکھیں بند کر لیتی ہیں...... نگی اپنے کمرے میں کوئی کتاب کھول کر بیٹھ جاتی۔

شاید شام ہونے والی ہے......!

''مورے مندر اجہوں نہیں آئے...... کون چوک بھئی مو سے آلی!''

شام کے بڑھتے سائے ادشا کو چاروں طرف سے گھیر لیتے اور وہ جے جے ونتی کے سر گنگنانے لگتی۔ ''ممی اپنے ہر موڈ کا اظہار صرف تان پورے پر کرتی ہیں۔''

نگی کے ڈیڈی موہن کو بھی ادشا کے اس موڈ پر ہنسی آتی تھی۔

وہ نگی سے کہتے تھے...... ''سارے کلاکار کسی نہ کسی راگ کو کھوجتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ کھوج ہی کسی راگ کی پہچان بن جاتی ہے...... کسی دیوتا کی بانی...... کسی شاعر کا شعر......''

نگی کو اپنے ڈیڈی پر پیار آ جاتا...... بچارے ڈیڈی...... کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ممی اپنی لمبی تانوں کے ساتھ کتنی دور چلی جاتی ہیں...... جیسے کسی کا پیچھا کر رہی ہوں...... وہ پھر کب لوٹ کر آئیں گی......؟

ادشا کہتی تھی...... ''نگی...... یہ کومل سُر ہیں...... ادھورے سُر...... میں کومل سُروں سے آگے نہیں بڑھی''...... مگر نگی کو ایسا لگتا ممی ایک سُر پر ٹھہر کر کسی کو پکار رہی ہیں۔

''ممی! آپ کسی راگ کو کیسے ڈھونڈتی ہیں۔ مجھے تان پورے پر گا کر سکھایئے نا'' نگی ممی کے پاس آ بیٹھی......

''ہٹ پگلی...... میں ابھی تک کسی راگ کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکی۔ ادھر اُدھر بھٹکتی ہوں۔ میں تمہیں آفتاب احمد کی غزل سناؤں...... سنو، راگ کافی یہ ہے......''

ادشا کو آفتاب احمد کا کیسٹ لگانے کا بہانہ چاہیے اور پھر آفتاب کی آواز سن کر موہن بھی

نیوز پیپر ایک طرف پھینک دیتا......راگ کافی کیا ہے؟ نگی یہ غزل آفتاب احمد سے سننے کی بجائے ممی کے چہرے پر پڑھنے لگتی تھی:

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے

یادِ جاناں، قدم سنبھال اپنا

موہن کبھی آنکھیں بند کرکے راگ کی گہرائی میں ڈوب جاتے، کبھی ممی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ''ادشا، تم نے آفتاب سے کچھ نہیں سیکھا۔ ادھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہو......''

ادشا جیسے اپنی سدھ بدھ کھو دیتی تھی......وہ آفتاب احمد کے ساتھ ساتھ گانے لگتی۔ ان کے ہر ایکشن کا ساتھ دینے پر موہن کو ہنسی آجاتی۔ نگی کو غصہ آتا......وہ وہاں سے ہٹ جاتی تھی ......''اگر میں کسی سر کو پکڑ لیتی تو......تو......'' ادشا سوچ جاتی تھی۔ کچن میں سبزی کاٹتے میں پھر گنگنانے لگتی:

یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا......

رات کو موہن ادشا کے ہاتھ سے تان پورہ چھین کر ایک طرف رکھ دیتا تھا۔ پھر اس کی گود میں لیٹ کر ادشا کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ نگی اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھتی اور انتظار کرتی تھی کہ اب ممی ڈیڈی کے لیے کوئی پیار بھرا گیت گائیں گی۔ مگر ڈیڈی کا ہاتھ ممی کے ہاتھ میں ہے اور ممی جانے کس راگ کی کھوج میں کہیں دور چلی گئی ہیں......

''ممی ہر وقت اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہیں؟'' کبھی نگی بور ہو کر ڈیڈی سے پوچھتی تھی۔

''کلاکار ہے تمہاری ممی۔ ہر وقت سنگیت کی دنیا میں کھوئی رہتی ہے۔''

نگی بڑے غور سے اپنے ڈیڈی کو دیکھتی تھی۔ انہوں نے اپنی بیوی کو کتنے اونچے استھان پر بٹھا دیا ہے۔

ڈیڈی ممی کی گود میں لیٹے ہیں اور ممی تان پورے پر کوئی راگ ڈھونڈ رہی ہیں۔

''ممی جانے کون سے راگ کے پیچھے جا رہی ہیں......'' نگی آنکھیں بند کر لیتی......

بلاول! انہیں ایمن......! اونہہ......اب تو شام کے سائے منڈلانے لگے ہیں اور اب ممی سوہنی کے سُروں کو چھونے دھیرے دھیرے آگے بڑھیں تو جیسے ایک ایک کرکے چراغ بجھنے لگتے ہیں اور پھر اس بڑھتے ہوئے اندھیرے میں جیسے ممی اور ڈیڈی گم ہونے لگتے ہیں......

جیون جوت جلے……

جب ادشا نگی کو سنگیت سکھانے بیٹھتی تھی تو نگی بور ہو جاتی تھی۔

''ممی آپ کسی راگ کو کیسے ڈھونڈ لیتی ہیں……؟''

''کہاں ڈھونڈا؟ مجھے کچھ نہیں ملتا…… اگر وہ مل جاتا تو……تو……'' ادشا جانے کن یادوں میں گم ہوگئی۔

''وہ……! وہ کون ممی……؟'' نگی بڑے غور سے ادشا کی طرف دیکھتی تھی۔

''وہی…… جسے ہمیشہ گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔''

ادشا جب اپنی بیٹی سے باتیں کرتی تھی۔ ادھوری ادھوری……موہن نگی سے کہتا تھا، ''تمہاری ممی بہت بڑی آرٹسٹ ہے۔ ہر وقت کلا کی دنیا میں گم رہتی ہے۔''

مگر ایک ٹی وی انٹرویو میں ادشا نے کہا، ''میں تو ابھی سر کی کھوج میں ہوں۔ اس سے آگے نہیں بڑھی۔''

کون سا راگ……؟ کون سا سُر……؟

نگی کو ایسا لگتا تھا ڈیڈی ممی کو ایک بڑی آرٹسٹ بنا کر کسی اونچے استھان پر ایک گڑیا کی طرح بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ سے بہت دور……

نگی کالج کے ڈراموں میں کام کرتی تھی۔ کبھی اسے ایسا لگتا وہ کسی ڈرامے کا ایسا کریکٹر ہے جسے کسی نے پوری طرح نہیں لکھا۔

وہ ہر وقت اپنے بارے میں سوچتی ہے۔

موہن آفس سے آتا تھا تو شراب کا گلاس تھام کر ٹی وی پر کارٹون دیکھنے لگتا۔ پھر اسے درباری کے سُر سلاتے تھے تو بھرویں کی تانیں جگاتی تھیں۔ اکیلی نگی سارے گھر میں دوڑتی پھرتی۔

''ممی، کل آپ کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے چیک اپ کے لیے۔''

''نہیں۔ میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گی۔'' ادشا نے غصے میں کہا۔

''آپ کتنی کمزور ہوگئی ہیں……کبھی آئینہ دکھاؤں آپ کو؟''

''نگی……؟'' ادشا نے گھبرا کے اپنی بیٹی کو دیکھا……''تو مجھے آئینہ دکھائے گی……جانتی ہے……پھر کیا ہوگا……؟''

نگی کو ہنسی آ گئی...... ’’کیا ہو گا ممی......؟‘‘

’’بس کیسی ہوں......! کون ہوں......؟ کیا یہ سب آئینے میں نظر آ جائے گا؟‘‘

’’تو پھر آپ کا انجیو گرام ہو گا۔ تب پتا چلے گا آپ کے دل کی راہیں کیوں بند ہیں......؟‘‘

’’نہیں، نہیں......!‘‘ ادشا گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔ ’’میرے دل کی راہیں کیوں بند ہیں...... یہ ڈاکٹر کیا جانے......؟ اس نے ’’دیوانِ غالب‘‘ کھول کر دیکھا — شاید دل کا دردِ غالب ہی کم کریں گے۔

نگی ماں کے پاس آ بیٹھی۔ پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ’’ممی...... میں تو جب آئینہ دیکھتی ہوں اپنے آپ کو پہچان لیتی ہوں۔‘‘

’’نہیں...... تو کیا جانے تو کون ہے......؟‘‘

آج ادشا کی یہ بات سن کر نگی گھبرا گئی...... وہ ماں کے پاس سرک آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر بولی۔

’’بتاؤ ممی...... میں کون ہوں......؟‘‘

ادشا نے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے نگی کے گرم ہاتھ تھام لیے اور پھر دھیرے دھیرے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔ ’’یہ تو میں بھی نہیں جانتی تجھے کس راگ کی کھوج نے جنم دیا ہے۔ آفتاب احمد کہتے تھے...... آفتاب احمد......‘‘

آفتاب احمد کا نام آتے ہی نگی ادشا کو دیکھنے لگی۔

’’ممی! آپ کو بچپن سے سنگیت سیکھنے کا شوق تھا......؟‘‘

’’ہاں...... میرے نانا پنڈت شنکر آچاریہ اندور گھرانے کے مشہور گائیک تھے۔ انہوں نے میری ماتا جی کو سنگیت سکھائی اور میں کالج کے بعد سنگیت سیکھنے پنڈت ہری گوپال کے گھر جاتی تھی۔‘‘

’’ہونہہ......‘‘ نگی ممی کی بات سننے کی بجائے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

ادشا پرانی یادوں میں کھو گئی......

’’ہمارے کالج کے فیسٹیول میں موہن بھی اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ آئے تھے۔ اس دن میں نے جے جے ونتی راگ گایا تھا...... ’’مورے مندر ابھوں نہیں آئے۔ کون چوک بھئی موسے آ ہلی......؟ موہن کو میرا گیت بہت اچھا لگا تھا۔‘‘

''صرف گیت......؟'' نگی نے ہنس کر ادشا کی طرف دیکھا۔

''ہٹ......شریر کہیں کی......'' ادشا شرما گئی۔

''تو پھر شادی کے بعد تو ڈیڈی دن رات آپ سے گیت سنتے ہوں گے......؟''

''نہیں......'' ادشا اداس ہو گئی۔

''ہمارے بیاہ کو چار مہینے بھی نہیں ہوئے تھے۔ تمہارے ڈیڈی کو شکاگو یونیورسٹی کا ایک اسکالرشپ مل گیا۔ انہیں ایک برس کے لیے امریکا جانا تھا۔''

نگی کو ممی کا اداس چہرہ دیکھ کر اچھا نہ لگا۔

''تو پھر آپ میرا بائی کے بھجن گانے لگیں ڈیڈی کی یاد میں......!''

''ہٹ......شریر کہیں کی......'' ادشا نے بڑے پیار سے نگی کو دھکیل دیا......

''میرے ڈیڈی اس وقت پاکستان کی انڈین ایمبیسی میں فرسٹ سیکریٹری تھے۔'' ادشا پرانی یادوں میں کھو گئی۔

''موہن نے کہا، تم بھی ان کے ساتھ ایک برس کے لیے پاکستان چلی جاؤ۔''

''نہیں......مجھے پاکستان اچھا نہیں لگتا۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''وہاں بھی بہت اچھے گانے والے ہیں۔ عابدہ پروین، غلام علی، مہدی حسن اور آفتاب احمد......''

''آفتاب احمد......؟'' ادشا یہ نام سن کر چونک پڑی تھی۔

اسے آفتاب احمد بہت پسند تھے۔ جب وہ ٹی وی پر گاتے تھے تو وہ انہیں دیکھے جاتی۔ ان کی گائی ہوئی غزلوں کے کیسٹس وہ بار بار سنتی تھی۔

''آفتاب تو میرا دوست تھا۔ میرا کلاس فیلو تھا۔ پھر پاکستان چلا گیا۔ اب تو بہت بڑا موسیقار بن گیا ہے۔ میں اسے فون کر دوں گا۔ تم اس سے غزل گانا سیکھ لینا۔''

''تو آپ پاکستان چلی گئیں......؟''

نگی کی آواز پر ادشا جانے کہاں سے لوٹ آئی۔

ادشا جب نگی کو یہ کہانی سناتی تھی، نگی اس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ، اندھیرے اجالوں کی پرچھائیوں میں جانے کیا ڈھونڈتی تھی۔

''ممی...... بولیے نا...... پھر کیا ہوا......؟''

ادشا چونک پڑی۔ نگی کو یوں دیکھنے لگی جیسے کسی اجنبی چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''پھر موہن نے آفتاب کو فون کیا...... میں نے آفتاب کی آواز سننے کے لیے کارڈلیس فون اٹھالیا تھا۔ دونوں ہنسی مذاق کرنے لگے۔''

''آفتاب موہن سے کہہ رہے تھے، یار سمجھ میں نہیں آتا باوا آدم کو اپنے ساتھ حوا کو دنیا میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''سچ کہہ رہے ہو آفتاب......'' موہن کو ہنسی آ گئی۔

''دنیا کو سنوارنے کی اسکیم تو دھری رہ گئی اور عورت کو سمجھنے کی کھوج میں آج تک لگے ہوئے ہیں۔''

پھر موہن نے انہیں ڈانٹ دیا۔

''مگر تم کسی عورت کے چکر میں پڑ کر غزل گا نا مت بھول جانا۔''

موہن نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی آفتاب سے۔ مگر وہ موہن کی بات سن کر اداس ہو گئے تھے۔

''موہن یار...... میری زندگی میں تو ہر عورت نے زہر گھولا ہے...... میری سوتیلی ماں تھی۔ پھر بے وفا محبوبہ ملی۔ پھر اتنی عقل مند بیوی ملی جو مجھ جیسے لاپروا انسان سے دور چلی گئی......''

''ہاہاہا''...... دونوں مل کر زور زور سے ہنسنے لگے۔''

مگر ادشا نے بڑے دکھ کے ساتھ فون رکھا تھا۔ ''بچارا...... اتنا بڑا فن کار اور کسی عورت کا پیار بھی نہیں ملا۔''

رات کو وہ موہن کے پاس لیٹی تو آفتاب کا ذکر بیچ میں آ گیا۔

''اتنا بڑا کلاکار ہے اور بچارے کو کسی بھی عورت کا پیار نہیں ملا۔'' ادشا نے بڑے دکھ سے کہا۔

''یہ کلاکار لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' موہن نے لاپروائی سے کہا۔

''رومانس تو چلتے ہی رہتے ہیں مگر شادی ہمیشہ بے وقوف عورت سے کرنا چاہیے۔''

''اچھا......؟ تو اسی لیے تم نے مجھے پسند کیا تھا......!

موہن کو ہنسی آ گئی...... ''اگر تم بے وقوف نہ ہوتیں تو میرے جیسے ایک سائنٹسٹ سے بیاہ کیوں کرتیں! اتنی بڑی آرٹسٹ ہو۔ پبلک ٹکٹ لے کر تمہارا گانا سننے آتی ہے۔ تمہیں تو آفتاب جیسے کسی کلاکار سے بیاہ کرنا تھا۔''

''چھی......'' ادشا نے آفتاب کے نام کو بھی جیسے دور ہٹا دیا تھا۔

''ان کلاکاروں کے ساتھ کوئی عورت جیون گزار سکتی ہے؟ ہر آن ان کا موڈ بدلتا رہتا ہے۔''

''میڈم جی...... مگر ایک بچارہ ہر آن موڈ بدلنے والی کلاکار کے ساتھ جیون بتا رہا ہے۔''

موہن نے ادشا کی پیار بھری مار سے بچنے کے لیے چادر میں منہ چھپا لیا۔

''آفتاب احمد جانے کیسا ہوگا......؟ اتنا بڑا فن کار۔ شاید مجھ سے بات بھی نہ کرے۔''

''بہت ہینڈسم ہے۔ بڑا ہنس مکھ بھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں غزل گانا سکھا دے۔''

''کیا......؟'' ادشا خوشی کے مارے رات بھر سو نہ سکی...... خواب میں بار بار آفتاب احمد اس کی طرف دیکھ دیکھ کر گنگنا رہے تھے......

''تو پھر آپ آفتاب احمد سے ملیں......؟'' نگی ادشا کے سامنے پاؤں پھیلا کے بیٹھ گئی۔

''ہم اسلام آباد گئے تو ڈیڈی نے مجھے ڈانٹ دیا۔

''پاکستان میں انڈین قونصلیٹ کا کوئی آدمی وقت لیے بغیر کسی سے نہیں مل سکتا اور پھر تم......! ایک پاکستانی گانے والے کے گھر جاؤ گی......؟''

پھر میں نے آفتاب احمد کو فون کیا۔ رات کو ان کا کوئی کنسرٹ تھا۔ انہوں نے ہم سب کو وہاں بلایا...... ہم گئے تو پورا ہال بھر چکا تھا۔ پھر آفتاب احمد آئے۔ شلوار سوٹ پہنے...... منہ پر بال بکھرے ہوئے......''

''ممی! آفتاب انکل ہر وقت ہنستے رہتے ہیں نا۔ غزل گاتے وقت بھی مسکراتے ہیں۔''

نگی کو آفتاب کے چہرے پر آنے جانے والا یہ موڈ یاد تھا۔

''جب وہ کوئی اچھا شعر گاتے ہیں نا تو بس جیسے سننے والے کی طرف ہی دیکھے جاتے ہیں، چھی...... مجھے تو شرم آتی تھی جب وہ...... وہ......''

ادشا جانے کیا کیا یاد کرتے کرتے کہاں پہنچ گئی......

''طبلے والا ان کی تانوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش میں سارے بدن سے کانپ رہا تھا اور سارنگی بجانے والا تو جیسے راگ کافی کے سروں کو ڈھونڈتا میرے سات ساتھ کہیں دور چلا گیا تھا......

گانا ختم ہوا تو آفتاب پر پھولوں اور نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ انہوں نے سب کو جھک جھک کر سلام کیا اور ڈائس سے یوں غائب ہو گئے جیسے کوئی رنگین خواب..... مجھے کافی کے اداس سروں نے گھیر لیا تھا۔

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے..... یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا

''اٹھو..... چلو.....'' ممی نے مجھے پکڑ کے اٹھایا تھا۔

''ممی ڈائس کے پیچھے چلیے نا۔ آفتاب احمد سے ملیں گے۔''

''نہیں.....'' ڈیڈی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ''تم ایک گانے والے سے ملنے جاؤ گی.....؟''

دوسرے دن آفتاب احمد نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ وہ اپنے دوست موہن کی بیوی سے ملنا چاہتے تھے۔''

''کیسا تھا ان کا گھر.....؟'' نگی آج بڑے غور سے یہ کہانی سن رہی تھی۔

''موہن ٹھیک کہتے تھے کہ وہ بڑا من موجی آرٹسٹ ہے۔ اسی لیے بیوی چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنے شاندار گھر میں وہ تو اکیلا تھا۔ سارا گھر نوکروں اور دوستوں سے بھرا رہتا۔ آفتاب صبح ریاض کرنے سے پہلے پیتے تھے۔ گانے کے بعد۔ دوستوں سے اچھی باتیں کرنا ہوں تو کہتے تھے ......'بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر'..... جب اپنے دکھوں کو یاد کر کے روتے تھے تو کانپتے ہاتھ میں گلاس اٹھا لیتے۔

پھر ڈیڈی نے مجھے ان سے گانا سیکھنے کی اجازت دی۔''

نگی سے باتیں کرتے کرتے ادشا کہیں دور چلی گئی......

آفتاب احمد تان پورہ سنبھالتے اور ادشا اپنے آپ کو سنبھالتی۔

وہ ادشا کے پاس آ کر بیٹھ جاتے۔ تان پورے پر رکھی ہوئی ادشا کی انگلیوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوزیشن ٹھیک کرتے..... '' گاؤ..... شروع کرو۔''

ادشا گھبرا کے ان کے چہرے پر سُر ڈھونڈنے لگتی تھی۔ ان کی بے تاب انگلیاں تان پورے

پر کسی راگ کی کھوج میں کانپنے لگتی تھیں۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز۔

وہ اس مصرعے کو طرح طرح سے گاتے...... اپنے ساتھ آواز ملانے کو کہتے......

''گل نغمہ کسے کہتے ہیں...... جانتی ہیں آپ......؟''

''کسی راگ کو ساز سے ہم آہنگ کرنے کی جو کھوج ہے وہی گل نغمہ ہے۔''

پھر ان کا ہاتھ ادشا کے ہاتھ پر آجاتا...... دونوں ساتھ ساتھ راگ کی طرف بڑھتے۔ دھیرے دھیرے ادشا کی آواز دور کہیں چلی جاتی۔ وہ آفتاب کے چہرے پر سُر ڈھونڈنے لگتی اور آفتاب کی بے تاب انگلیاں جانے کس راگ کی کھوج میں کہاں چلی جاتی تھیں...... پھر فون کی آواز پر...... آفتاب چونک پڑے تھے۔

''ہیلو...... موہن......؟ امریکا سے بول رہے ہو......؟ ادشا اچھی ہے۔''

(ادشا اشارہ کر کے کہتی کہ موہن کو مت بتاؤ میں یہاں ہوں۔)

''میں تو چاہتا ہوں اسے غزل گانا سکھاؤں۔ مگر ابھی تو مجھے اس سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اچھا اب ایک اچھی بات سنو۔ ہم دونوں کے ساتھ ساتھ گائے ہوئے کیسٹس مارکیٹ میں آگئے ہیں...... تمہاری ادشا کی آواز پاکستان میں گونج رہی ہے۔''

''ممی...... ممی......! کیا آپ کو نیند آرہی ہے......؟''

نگی ادشا کو جگا رہی تھی...... جیسے آج ادشا ادھوری بات کر کے سوگئی تو نگی پھر کبھی نہ سو سکے گی۔

''مجھے بتایئے نا آفتاب انکل آپ کو سنگیت کیسے سکھاتے تھے......؟''

ادشا چونک پڑتی...... چاروں طرف دیکھتی اور پھر نگی کو پہچان کر دھیرے دھیرے کہتی۔

''وہ کہتے تھے راگ تو سمے اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ جب ایک برہن گھور اندھیاری میں اپنے پریتم کو پکارتی ہے تو پھر بھیرو کے سُر سورج کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور گھور اندھیاری میں کیدارا کے سُر بکھر کے جائیں تو اس کا پیا چاند بن کر آکاش پر چمکنے لگتا ہے......''

''پھر وہ آپ کے استاد بن گئے......؟'' نگی خوشی سے بولی۔

ادشا جانے کہاں چلی گئی تھی...... بہت دور سے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی اب۔

''انہوں نے مجھے سمجھایا......کبھی ہم راگ کی ترتیب بدل دیتے ہیں، آروہ کا مطلب ہے سروں کا ایک جگہ سے دوسری طرف جانا اور آروہی میں پہلے مقام سے پھر اسی طرف لوٹ جانا ......جب تم ساتویں سُر پر پہنچو گی تو 'نی' 'نکھاد' ہر راگ پورا ہو جائے گا۔''

ادشا آفتاب کی طرف دیکھ جاتی تھی۔

اس نے پانچ برس تک سنگیت سیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ راگ تو من کی پکار ہیں۔ انہیں گانے والے سرگم میں باندھ لیتا ہے۔

''تم ہمیشہ نکھاد تک پہنچتے پہنچتے رک کیوں جاتی ہو......'' آفتاب احمد جھنجھلا کر کہتے تھے۔

''گاؤ......گاؤ نا ادشا......'' وہ ادشا کی طرف جھک جاتے۔

در تا نا دیرے نا دیم تا نا نا

وہ آفتاب کے جھکے ہوئے چہرے کو ہٹا دیتی تھی۔

''نہیں......میں آخری سروں کو چھونا نہیں چاہتی......پھر کیا ہوگا......؟''

''آپ مجھے لوٹ جانے کے لیے کہیں گے آروہ کی طرف......'' وہ بے بسی سے ان کی طرف دیکھتی تھی......مگر آفتاب اس کا ہاتھ تھام لیتے۔ ہارمونیم پر انگلیاں رکھ کر کہتے......اور پھر ان کی انگلیاں میرے من کے کسی ساز پر چلی جاتی تھیں......

''ابھی تو جانے کتنے مقام ہیں جہاں تمہیں ٹھہرنا ہے۔ سُر کو اونچا لے جانا ہے۔ الاپ......تکرار......الاپنے......بہلاوے......اور پھر اسی سُر کی طرف لوٹ آنا۔''

''پھر کیا ہوا امی......؟'

''پھر تمہارے ڈیڈی شکاگو سے اسلام آباد آئے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کو......

جب ہم آخری بار آفتاب احمد سے ملنے گئے تو موہن نے میرا ہاتھ پکڑ کے اٹھایا۔''

'اب جلدی چلو۔ فلائٹ کا ٹائم ہو گیا۔'

میں جھٹ اس جگہ سے اٹھ گئی جہاں بیٹھنے کے لیے میں نے جانے کتنا سوچ بچار کیا تھا......''

اس دن آفتاب اور موہن ہنستے رہے۔ ایئر پورٹ پر آفتاب کانپ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے موہن کی طرف دھکیل دیا۔

'تمہاری بیوی تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کا ہاتھ تھام لو۔'

مگر موہن نے میرا ہاتھ نہیں تھاما۔ میں آج تک ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی ہوں۔
جب ہم ڈپارچر کیبن کی طرف جانے لگے تو آفتاب نے پکار کے کہا...... ''موہن...... ذرا ٹھہرو...... ایک بات سن لو۔''

ہم دونوں پلٹ آئے......

''کہو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟......'' موہن نے جھنجھلا کر پوچھا۔

''وہ...... وہ...... جاؤ...... جاؤ......'' اپنے کانپتے ہاتھ کو اٹھا کر انہوں نے کہا۔

''شراب نے تباہ کر دیا ہے اس شخص کو......'' موہن نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔

''صرف شراب نے......؟'' مگر میں نے یہ بات موہن سے نہیں کہی۔

''ممی...... آپ کو یہ سب باتیں ابھی تک یاد ہیں......'' نگی بڑی محبت سے ادشا کی گود میں لیٹ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''اٹھارہ برس ہو گئے......'' ادشا نے دور کہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسی سال تو پیدا ہوئی تھی۔''

''آپ پاکستان سے کب آئی تھیں...... کس مہینے میں......؟'' اب نگی اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

''جنوری میں......''

''اور میں کب پیدا ہوئی تھی......؟''

''اگست میں...... تجھے اپنی برتھ ڈے یاد نہیں ہے......؟''

دونوں کچھ دیر چپ رہیں...... پھر ادشا نے دھیرے سے کہا۔ ''تمہارے ڈیڈی کے دل میں بھی یہ شک تھا۔'' ادشا نے نگی کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔

''اور آپ کو......؟'' نگی نے ادشا کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔

''میں تو کسی راگ کی کھوج میں بھٹک رہی تھی۔ ابھی بہت سے مقام تھے جہاں سُر کو اوپر لے جاتے ہیں۔ الاپ، بہلاوے۔ الاپ...... میں پھر اسی سُر کی طرف نہیں لوٹی...... نکھاد...... جہاں ساتوں سر ختم ہو جاتے ہیں......''

نگی نے دیکھا...... ممی آخری سُر کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔
مگر ادشا سوئی نہیں تھی...... اس کے چاروں طرف جانے کتنے اندھیرے اجالے گڈمڈ

ہو رہے تھے۔ ایک بار آدھی رات کو فون کی بیل سن کر ادشا جاگ گئی۔

موہن گہری نیند میں تھا......

اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔ ''ہیلو......ادشا......! میں ہوں۔ میں......میں......''

''ہاں ہاں......تم ہو......کہو کیا بات ہے......؟''

''ادشا......میں وہ شعر بھول گیا ہوں۔ آج اسے گنگنانے کو جی چاہ رہا ہے......کون سا شعر تھا......؟''

''دھیان کے آتش دان میں ناصر
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے''

ادشا نے شعر سنا کر فون رکھ دیا......یہ غزل آفتاب نے کبھی نہیں گائی تھی......وہ اس وقت مجھ سے کوئی شعر سننا چاہتا تھا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا......موہن گہری نیند سو رہا تھا۔

موہن صبح اٹھا تو جیسے جاگا ہی نہیں تھا۔ سویا سویا......کھویا کھویا......

''ایک بار آفتاب انکل کا فون میں نے اٹھایا تھا'' نگی آہستہ بولی۔

''اچھا......'' ادشا نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ مجھ سے پوچھنے لگے۔ 'تم گل نغمہ ہو......؟' میں نے کہا......'اسے تو میں بھی ڈھونڈ رہی ہوں انکل۔ مجھے بتایئے......کہاں ملے گی وہ......' آفتاب انکل چپ ہو گئے......پھر آہستہ سے بولے۔ 'جانے کون سا وقت تھا وہ......جانے کون سا راگ تھا وہ'' نگی جانتی تھی اب ممی تان پورہ تھام کر اپنی آنکھیں بند کر لیں گی اور سوہنی کے اداس سر انہیں اندھیرے میں گم کر دیں گے۔

جیون جوت سے جلے......

''ممی......پاکستان چلو نا۔ آفتاب انکل سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔''

ادشا چونک پڑی......

''کیوں......؟ تو آفتاب احمد کو کیوں دیکھنا چاہتی ہے......؟''

''ممی......بات یہ ہے کہ......کہ......'' نگی بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔

''میں انہیں دیکھ لوں گی تب ہی تو پتا چلے گا کہ میں ان سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟''

ادشا ڈر گئی...... نگی ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کی طرح اس کے چہرے پر کسی جرم کا سراغ ڈھونڈ رہی تھی۔

موہن نے نگی کی بات سنی تو جھٹ پاکستان جانے کو تیار ہو گیا۔

''نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔'' ادشا نے گھبرا کے کہا۔

''کیوں......؟'' موہن بولا...... ''چلو تفریح کریں گے۔ آفتاب سے ملیں گے...... اس سے غزلیں سنیں گے۔''

''نہیں نہیں...... بہت بکھیڑا ہے میرے لیے۔ یہاں کیا چھوڑوں...... وہاں سے کیا لاؤں؟......''

''ہم یہاں سے گل نغمہ لے جائیں گے...... اور وہاں سے آفتاب کی آواز لے آئیں گے۔''

مگر اچانک دونوں ملکوں کے بیچ لڑائی کا شور مچ گیا...... راستے بند......

دونوں ملکوں کے لیڈروں نے اپنے میزائلوں کا رخ ایک دوسرے کی طرف کر دیا۔

''آفتاب، یار...... ہم نہیں آسکتے...... تم نے اپنے میزائلوں کا رخ ہماری طرف کر دیا ہے۔''

''نہیں...... ہم اپنے میزائلوں کا رخ اس طرف کیسے کر سکتے ہیں یار جہاں گل نغمہ سو رہی ہے۔ ادشا سے کہو اہیر بھیرو شروع کر دے۔ میزائلوں کے دھماکے سنائی نہیں دیں گے پھر......''

''چھوڑو یار یہ فضول باتیں......'' موہن نے جھنجلا کر کہا۔ ''تم اپنے آپ کو تان سین سمجھ رہے ہو کہ میگھ ملہار گا کر جنگ کے شعلے بجھا دو گے......!''

''ہم فن کار لوگ جنگ کی آگ کیسے ٹھنڈی کریں گے۔ یہ بعد میں بتائیں گے۔''

''تم جلدی سے اپنا ٹی وی آن کرو۔ لاہور سے میرا پروگرام ہو رہا ہے۔''

نگی نے جلدی سے پی ٹی وی آن کیا۔

آفتاب احمد ہاتھ اٹھا کر، آنکھیں بند کر کے اہیر بھیرو شروع کر رہے تھے۔

''ایک پتھر جو دستِ یار میں ہے
پھول بننے کے انتظار میں ہے''

☆☆

ایک شوٹنگ اسکرپٹ

''سچ چلا کر نہیں بولتے آکاش..... سچ تو کڑوے گھونٹ کی طرح حلق میں اٹک جاتا ہے۔''

ڈائریکٹر بھوش نے آکاش کو سمجھایا۔ آکاش ایک منتری کا میک اپ کرنے کے بعد چلاّ چلاّ کر اپنے ڈائیلاگس یاد کر رہا تھا۔

''تم ایک منسٹر ہو، اس لیے جھوٹ بول رہے ہو۔ مگر ایک سچے انسان کی ایکٹنگ کر رہے ہو۔ ایسے..... اپنے ہاتھ اٹھا کر آنکھیں بند کر کے..... ذرا کیمرے کے اور سامنے آجاؤ.....''

ڈائریکٹر بھوش نے آکاش کے کاندھے پکڑ کے اس کا سر اونچا کیا۔

آکاش نے سینہ تان کر، ہاتھ اٹھا کر کہا ''اپوزیشن پارٹی والے جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں جو کچھ کہوں گا، سچ کہوں گا۔ سچ کے سوا.....'' آکاش کی اس ایکٹنگ پر میک اپ مین، اسکرپٹ رائٹر، اسپاٹ بوائے، کیمرہ مین، سب ہنس پڑے.....

''تم منتری بن گئے ہو آکاش بابو..... پھر بھی سچ بولو گے.....؟''

آکاش کو بھی ہنسی آ گئی۔

اب شوٹنگ شروع ہونے والی تھی۔

ڈائریکٹر بھوش حسب عادت بے حد پریشان تھا۔ ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔

چلاّ چلاّ کر کبھی کیمرہ مین کو پکارتا کبھی آرٹ ڈائریکٹر کو۔

آرٹ فلم کا پلان کرتے ہی اس نے داڑھی بڑھالی تھی۔ بڑا سا ہیٹ پہن لیا تھا۔ کاندھے پر ایک جھولا بھی ڈال لیا تھا..... ہاف پینٹ پر ایک میلی کچیلی سی شرٹ پہننے کے بعد جب اس نے منہ میں سگریٹ بھی دبا لیا تو بالکل آرٹ فلم کا ڈائریکٹر بن چکا تھا۔ اب وہ کبھی کیمرہ مین کی طرف بھاگتا تو کبھی آکاش کو ایک منسٹر بنانے میں جٹ جاتا۔

''یہ Episode یوں شروع ہوگا کہ پولیس والے سڑکوں پر سے لاشیں اٹھا رہے ہیں اور چور اچکے جلی کٹی عورتوں کی لاشوں پر زیور ڈھونڈ رہے ہیں اور......''

''اسٹاپ سر......''اسکرپٹ رائیٹر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''یہاں تو ہمیں یہ Episode ختم کرنا ہے۔ہم تو چاروں طرف لاشوں کے ٹکڑے دکھائیں گے اور ان لاشوں کو جلدی جلدی لاریوں میں بھر کے لے جانے والے لوگ......پھر ان لوگوں سے پیسے وصول کرنے والے پولیس کے سپاہی......''

''اچھا......تو پہلے ہمیں منتری جی کے شارٹس لینا ہیں!''اسکرپٹ رائیٹر نے اپنی فائل کھول کر دیکھا۔

''اچھا......منتری جی کی پریس کانفرنس ہوگی۔پھر ان کا ٹی وی انٹرویو......وہ سیٹ تو تیار ہے نا......؟ آکاشؔ! تمہیں اپنے ڈائیلاگس یاد ہیں......؟''

ڈائریکٹر بھوشؔ نے گھبرا کے اپنا سگریٹ سلگانے کی کوشش کی۔مگر ان کا لائیٹر کام نہیں کر رہا تھا۔جلدی سے ایک اسپاٹ بوائے نے اپنی ماچس نکال کر انہیں دے دی۔

''اور سب ایکٹر کہاں ہیں......؟''ڈائریکٹر بھوش گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

''سب ریڈی ہیں سر......سب کا میک اپ ہوگیا ہے۔انسپکٹر،......نوجوان، پریس رپورٹر پانچ ایکٹرا ہیں ہیں جو لاشوں کو لاریوں میں بھر کے لے جائیں گے اور دس عورتوں کو لاشوں کا میک اپ کر کے گراؤنڈ پر ڈال دیا ہے۔''میک اپ مین جانؔ جلدی جلدی بھوشنؔ کو اپنا کام بتا رہا تھا۔

''سیٹ تیار ہے سر......''کیمرہ مین ٹرالی کے اوپر بیٹھ کر نیچے کا سین فوکس کرنے لگا۔

مگر میک اپ مین ابھی تک آکاش کو منتری جی کی شان دکھانے کے لیے رنگوں کے برش ان کے چہرے پر گھسے جا رہا تھا۔

''سنو آکاش......''ڈائریکٹر بھوشن نے آکاشؔ سے کہا۔

''اپوزیشن کا ریمارکس سنتے وقت کیمرہ تمہیں فوکس کرے گا......یوں......''بھوشنؔ نے دونوں ہاتھوں سے کیمرے کا پوز بنایا اور دھیرے دھیرے آکاشؔ کی طرف بڑھنے لگا......

''اب تم کلوز اپ میں آجاؤ گے۔''

''اور اس وقت اپوزیشن لیڈر کے ریمارکس سن کر مجھے غصہ آجائے گا۔''آکاش نے

ایک منسٹر کی طرح سر اونچا کر کے بڑی شان سے کہا ''میں جو کچھ کہوں گا۔ سچ کہوں گا...... گجرات میں دو ہزار نہیں صرف ایک ہزار بچوں کا قتل ہوا ہے اور جن عورتوں کی بے عزتی ہوئی ہے ان کا قتل ہوا ہے۔ ان ظلم کرنے والوں کو میں ایسی سزائیں دوں گا کہ...... کہ......''

''مگر سچی بات کہتے ہوئے اتنا چلانا نہیں چاہیے۔'' ڈائریکٹر بھوشن نے اسے روک دیا۔

''اسٹاپ......'' اسکرپٹ رائیٹر بھوشن کے پاس آ گیا اور اپنی فائل کھول کر بولا ''مسٹر آکاش...... آپ کے یہ ڈائیلاگس ہیں......'' عورت کے ساتھ ایسے ظلم تو ہمیشہ ہوتے ہیں...... یہ تو ہمارے دیش کی پرمپرا ہے۔ آگے بھی ایسا ہوتا رہے گا۔''

آکاش نے بھوشن کی طرف دیکھا۔ پھر اسکرپٹ رائیٹر سے بولا ''یہ ڈائیلاگس بدل دو یار۔ ایک منتری کا عورت کے بارے میں یہ کہنا اچھا نہیں لگتا......''

''سائیلینس پلیز...... مسٹر آکاش...... آگے آیئے......'' کیمرہ مین ٹرالی پر بیٹھا چلانے لگا۔ پھر اس نے اپنے منہ پر سے کپڑا اہٹا کر میک اپ مین سے کہا ''آپ نے آکاش کے منہ پر بہت میک اپ کر دیا ہے۔ کم کرو۔ منتری جی کی صورت ایک نارمل آدمی جیسی بناؤ نا۔''

''نہیں...... منتری نارمل آدمی نہیں ہوتا......'' بھوشن ہنسنے لگا اور پھر آکاش سے بولا ''یہ ڈائیلاگس بولتے وقت تم آنکھیں بند کر لینا۔ پھر تمہیں غصہ آ جائے گا ان مرنے والی عورتوں پر جنہوں نے سڑکوں پر دم توڑ کر سرکار کو بدنام کیا ہے...... دیکھو...... ایسے...... ایسے......'' بھوشن نے گردن اونچی کر کے اِدھر اُدھر دیکھا......

وہ کتنے دھیرج کے ساتھ...... رُک رُک کر آنکھیں بند کر کے ہنس ہنس کر بولتے ہیں......؟ پھر بھوشن نے میک اپ مین سے کہا ''اس کلوز اپ کے لیے آکاش کے منہ پر تھوڑا کالا رنگ اور لگا دینا۔''

''سیٹ او کے ہے سر...... لائٹس......'' تمام لائٹیں آن ہو گئیں، سائیلینس پلیز...... رول...... ایکشن......''

جیسے ہی لائیٹ آن ہوئی، کیمرہ مین نے ''ایکشن'' کہا۔ ایک چوکیدار چلاّتا ہوا کیمرے کے سامنے آ گیا......

''سر...... سر...... منتری جی آتے ہیں اسٹوڈیو میں...... ادھر آ رہے ہیں......''

''سامنے سے ہٹ...... بات نہیں کرنا...... اب منتری جی سیٹ پر آرہے ہیں۔'' ایک اسپاٹ بوائے نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

''منتری جی ادھر آرہے ہیں۔'' چوکیدار چلاّ۔ ئے جارہا تھا۔

کیمرہ مین نے کیمرہ ادھر فوکس کر کے دیکھا...... لانگ شاٹ میں چلتا ہوا وہ کیمرے کے سامنے آ گیا تھا۔ سفید دھوتی پر چمکدار کرتے میں اس کی توند ہل رہی تھی۔

''ابے سامنے سے ہٹ جا......'' ''وہ سچ مچ کے منتری جی آرہے ہیں'' چوکیدار چلاّنے لگا۔

کیمرہ مین نے کیمرہ فوکس کر کے دیکھا...... لانگ شاٹ میں چلتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا'' یہ کون سالا سیٹ پر آ گیا......؟'' اسسٹنٹ ڈائریکٹر ٹرالی کے اوپر سے گردن نکال کر چلاّیا۔

''نمستے جی...... نمسکار Congratulation سر...... مبارک ہو۔ آپ منتری بن گئے۔''

سارے اسٹوڈیو کے اہم لوگ اِدھر اُدھر سے بھاگتے ہوئے آ گئے۔

ان سب کو سیٹ پر دیکھ کر کیمرہ مین، بھوشن سب گھبرا گئے۔

''دھنیاواد...... آپ کی مہربانی......'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکرانے لگے۔

کیمرہ مین پریشان ہو کر بھوشن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لان میں کھڑے ہوئے سب لوگ پریشان ہو کر اس آدمی کو دیکھنے لگے جو بالکل آکاش کا میک اپ کیے گردن اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ دو باڈی گارڈ، پستول ہاتھوں میں تھامے تین چار پولیس والے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اِدھر اُدھر یوں دیکھ رہے تھے جیسے چاروں طرف لوگ بندوق تھامے منتری جی پر فائر کرنے آرہے ہوں۔

ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ سب گھبرا کے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہے۔ مگر شوٹنگ کا پورا اسٹاف پریشان تھا کہ منتری جی یہاں اسٹوڈیو کے اس فلور پر کیوں آ گئے ہیں......!

''یہ ہمارے نئے منتری جی ہیں۔ ایگری کلچر منسٹری سنبھالی ہے مہاشے نے۔'' منتری جی کے ساتھ چلنے والے ایک پولیس آفیسر نے اسٹوڈیو کے لوگوں کو بتایا اور چاروں طرف اس طرح دیکھا کہ لوگ اب تالیاں بجا کر منتری جی کا سواگت کریں۔

مگر شوٹنگ کرنے والے سب لوگ پریشان تھے۔ڈائریکٹر بھوشن بھی کیمرہ مین کے ساتھ ٹرالی پر بیٹھا رہا۔ نیچے اتر کے منتری جی کا سواگت کرنے کی بجائے وہ انتظار کرنے لگا کہ اب وہ آگے کہیں چلے جائیں گے تو شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔

''یہ منتری جی کو ادھر شوٹنگ کے وقت کیوں اندر آنے دیا......؟'' کیمرہ مین نے اسپاٹ بوائے سے پوچھا۔

''آپ کا میک اپ مین کہاں ہے......؟'' ایک باڈی گارڈ نے اسکرپٹ رائیٹر سے پوچھا۔

''وہ اسٹوڈیو میں ہمارے ایکٹروں کا میک اپ کر رہا ہے۔میک اپ روم میں ہے سر۔''

''اس کو بلاؤ...... ہمارے منتری جی کو بھی ابھی ایک پریس کانفرنس ٹی وی کے لیے ریکاڈ کروانا ہے......!''

''ابھی اسی وقت......؟'' اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے گھبرا کے کہا۔

''آپ ادھر اسٹوڈیو کے آفس جا کر پوچھئے۔یہاں تو آج ہر فلور پر شوٹنگ ہو رہی ہے۔''

اب ڈائریکٹر بھوشن کو ٹرالی سے نیچے اترنا پڑا۔اس نے سوچا ان منتری جی کو کسی بہانے کسی اور فلور کی طرف دھکیل کر وہ شوٹنگ شروع کر دے گا۔

''منتری جی، نمسکار...... بہت خوشی ہوئی آج آپ کے درشن ہو گئے......'' بھوشن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منتری جی کو نمسکار کیا اور پھر ایک آفس بوائے سے کہا ''منتری جی کا انٹرویو کور کرنے والی کون سے چینل کی ٹیم ائی ہے......؟ منتری جی کو اسٹوڈیو کے اسی فلور پر لے جایئے آپ لوگ......''

آکاش بڑی دلچسپی سے منتری جی کو تکے جا رہا تھا۔اسے اپنی توند اور بڑھانا اور گردن اونچی کر کے منہ ٹیڑھا کر کے بات کرنا چاہیے۔

اسٹوڈیو کی اتنی چہل پہل، کیمرے اور روشنی دیکھ کر منتری جی کہیں اور جانے کو تیار نہ تھے۔

''ہم کہیں نہیں جائیں گے۔پریس کانفرنس کی شوٹنگ یہیں کر دو۔''

''آپ کا میک اپ مین کہاں ہے...... منتری جی کو پہلے میک اپ روم میں لے جانا ہے۔'' منتری جی کے پی اے نے ڈائریکٹر بھوشن سے پوچھا۔

''میں یہاں ہوں، نمسکار منتری جی'' میک اپ مین دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔

پھر وہ سب منتری جی کو میک اپ روم کی طرف لے گئے ......

''پہلے تم اندر جاؤ......'' منتری جی کے پی اے نے ایک باڈی گارڈ سے کہا۔

وہ آدمی میک اپ مین کے ساتھ اندر آیا تو پھر بیگ میں سے Detector نکال کر میک اپ روم کے ہر کونے میں لے گیا۔ پھر میک اپ مین کو کھڑا کر کے اس کے سارے بدن پر Detector پھیرا۔ جیسے ڈھونڈ رہا ہو کہ اس نے اپنے کپڑوں میں بم تو نہیں چھپا لیا ہے۔

''یہ سب کیوں کر رہے ہو......؟'' میک اپ مین گھبرا گیا۔ ''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''جس روم میں منتری جی آنے والے ہیں اس کی ہم دیکھ بھال کرتے ہیں...... کیا پتا اس کمرے میں انہیں مارنے والا کوئی چھپ گیا ہو۔''

''اچھا......؟'' میک اپ مین گھبرا گیا۔

''تو سرکار اتنے برے آدمی کو منتری کیوں بناتی ہے جس کے دشمن ہر جگہ ہوتے ہیں......؟''

''ہشت...... دھیرے بول۔'' باڈی گارڈ منہ پر انگلی رکھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''تو کسی گاؤں سے آیا ہے کیا......؟ کچھ بھی نہیں جانتا......؟ منتری جی کے بنگلے پر بھی سیکوریٹی الارم ہے۔ جب وہ باہر جاتے ہیں تو ہم لوگ ان کے آس پاس پستول لے کر چلتے ہیں۔ تو نے کبھی سڑک پر کسی منتری کی سواری جاتے نہیں دیکھی ہے کیا......؟ گیارہ کاریں ان کے ساتھ چلتی ہیں۔ ایک گھنٹہ پہلے ٹریفک روک دی جاتی ہے۔''

''مگر ایک آدمی کے لیے اتنی کاروں کی کیا ضرورت ہے......؟''

میک اپ مین جلدی جلدی ٹیبل پر میک اپ کا سامان رکھ رہا تھا۔

''اس لیے کہ اگر کوئی منتری جی پر فائر کرے تو پہلے وہ گیارہ آدمی مارے جائیں گے۔''

''باپ رے......'' میک اپ مین گھبرا گیا۔

''منتری بھی ویرا اپن جیسا ہی ہوتا ہے......؟''

باڈی گارڈ بڑی شان سے ہنسنے لگا۔

''ہمارے منتری جی جس راستے سے گزرتے ہیں ان سڑکوں کو صاف کر کے وہاں دوائیں ڈالی جاتی ہیں۔''

''کیوں......؟'' میک اپ مین کام کرتے کرتے رُک گیا......

''کیا منتری جی جدھر جائیں وہاں کوئی بری بیماری پھیل جاتی ہے......؟''

دونوں کو زور کی ہنسی آ گئی۔ مگر باڈی گارڈ نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرایا ''ہشت ......جلدی کرو...... منتری جی باہر انتظار کر رہے ہیں۔ تھک جائیں گے۔''

''کیا منتری جی بیمار ہیں......؟؟'' میک اپ مین نے سوچا۔ ان کے منہ پر بہت میک کرنا ہوگا۔

''نہیں......روز صبح سویرے چار ڈاکٹر منتری جی کا چیک اپ کرتے ہیں۔''

''کیوں......؟ منتری جی کو کتنے روگ ہیں......؟''

''روگ نہیں...... فکریں، پریشانی......ڈر اور کام سے ان کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے...... پھر وہ چنچل چھوکریاں بھی انہیں گھیرے رہتی ہیں۔'' اس نے آنکھ دبا کر ایک فحش اشارہ کیا تو دونوں ہنس پڑے۔

''ابھی دیکھو...... یہاں بھی ایک چڑیا آنے والی ہے۔''

''منتری جی اندر آ رہے ہیں......'' ایک اور باڈی گارڈ اندر آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو میک اپ مین اور گھبرا گیا...... منتری جی کے ساتھ آکاش بھی اندر آگیا اور ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔

کیمرہ مین نے اشارے سے پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے تو وہ دھیرے سے بولا ''میرے کو منتری جی سے ایکٹنگ سیکھنا ہے۔ اب شوٹنگ شام کو ہوگی۔''

میک اپ کے بعد منتری جی کانفرنس ہال میں آئے تو میک اپ مین ساتھ ہی آیا۔

منتری جی نے ڈائریکٹر بھوشن کو بھی اتنی عزت دی کہ انٹرویو لینے والے ایڈیٹر اور نیوز رپورٹر کے ساتھ اسے بھی بٹھالیا۔ الگ الگ ٹی وی چینل والے اپنے اپنے کیمرے لیے چاروں طرف کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک عورت کے ہنسنے کی آواز آئی اور سلمیٰ علی مٹکتی تھرکتی ہوئی اندر آئی۔ اس دیکھتے ہی منتری جی کھل اٹھے اور اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا ''یہ مس سلمیٰ علی ہیں...... سوشل ورکر......سماج سدھار کے لیے عورتوں کی ایک سیوا منڈل بھی بنائی ہے۔''

''میں کیا کام کام کروں منتری جی...... شہر میں دو دن تک کرفیو رہا۔ سب کو کتنی تکلیف

ہوئی، سڑکوں پر لاشیں پڑی تھیں۔ ہر طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ لوگ چلا رہے تھے اور ہمارے گھر میں دودھ نہ سبزی...... ہم لوگ تو چائے بھی نہیں پی سکے۔''

سلمیٰ علی نے یہ بات اتنے دکھ بھرے انداز میں کہی کہ منتری جی نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

''منتری جی...... گجرات میں ایک ہزار بچوں کا قتل ہوا ہے...... آپ اس کے بارے میں کچھ کہیں گے......؟'' ایک رپورٹر کیمرے کے سامنے آ گیا۔

''صرف ایک ہزار......؟'' منتری جی نے بڑے اطمینان کے ساتھ پوچھا۔ ''مگر یہ آپ کے میڈیا والے تو شور مچا رہے ہیں کہ گجرات میں پانچ ہزار بچوں کا قتل ہوا ہے۔''

''منتری جی......! مجھے بھی آپ سے ایک سوال کرنا ہے۔'' ایک پریس رپورٹر آگے بڑھا۔ ''آندھرا پردیش کے ایک گاؤں میں ایک لیڈر نے اپنی ڈنر پارٹی میں پندرہ جنگلی پرندوں کا گوشت مہمانوں کو کھلایا ہے اور ایک فلم اسٹار نے ایک ہرن کا شکار کیا ہے......''

''اچھا......؟ اگر آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے تو وہ فائل میرے آفس بھیج دیجئے۔''

پھر انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ آنکھیں بند کر کے سر ہلا کر کہا ''جنگلی پنچھیوں کو مارنے کا انیائے ہم نہیں ہونے دیں گے۔''

وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر سلمیٰ علی کے پرفیوم کی خوشبو نے ان کا منہ ادھر پھیر دیا۔

''ابھی آپ لوگ وہاں بیٹھئے...... میں دس منٹ کے بعد آپ سب سے بات کروں گا۔''

سب باہر چلے گئے تو انہوں نے سلمیٰ سے سرگوشی میں کہا ''آپ تو اب نظر ہی نہیں آتیں۔ لیکن یہاں اس وقت اسٹوڈیو میں کیوں آ گئیں؟''

''آپ کا پی اے مجھے ملنے کا ٹائم ہی نہیں دیتا سر...... مجھے مزدور عورت کے ڈیمانسٹریشن کا ایک جلوس آرگنائیز کرنا ہے سر......''

''تو پھر اپوزیشن پارٹی والے پروٹسٹ کریں گے۔''

''جی باؤ...... دونوں پارٹیوں کے جلوس مجھے آرگنائیز کرنا ہیں سر......''

ہاہاہا...... منتری جی کو سلمیٰ کے اور قریب ہونے کا بہانہ مل گیا۔

''منسٹری سے فون آیا ہے کہ گاؤں والوں کے گھر توڑ کر جو ڈیم بنایا ہے اس کے خلاف

گاؤں والے مظاہرہ کررہے ہیں کہ وہ ڈیم توڑ دیا جائے۔''

''مگر اس کا خرچہ کون دے گا......''سلمیٰ نے گھبرا کر پوچھا۔

''وہ منسٹری سے مل جائے گا۔مگر ڈیم توڑنے کے جرم میں پولیس گاؤں والوں پر فائرنگ کرے گی۔دس بیس گاؤں والے مرجائیں گے۔پھر ہم اپوزیشن پارٹی والوں پر اس کا الزام لگائیں گے۔''

سلمیٰ یہ بات سن کر چپ ہوگئی تو منتری جی نے اسے سمجھایا''ان مزدوروں کے پریوار کی مدد کریں گے ہم۔......پر ان مزدوروں کی موت کا الزام آجائے گا۔''

''یہ سب بہت مشکل ہے منتری جی......وہ اپوزیشن پارٹی والا خان......؟''

''اسے ہم کسی اور اسکینڈل میں پھنسا دیں گے۔''

''ایکسکیوز می سر......''ایک باڈی گارڈ نے اندر آکر کہا۔

''پریس کانفرنس سے پہلے ڈنر تیار ہے......''اسٹوڈیو کے منیجر نے جھک کر کہا۔

''اچھا......اچھا......!''

باربی کیو گوشت کی خوشبو سے منتری جی کی بھوک جاگ اٹھی۔

ڈنر میں دلیپ سنگھ، آکاش، بھوشن، کیمرہ مین، سب منتری جی کا تماشا دیکھنے آگئے تھے۔

''آنے دو......سب کو آنے دو......''منتری جی نے خوش ہوکر کہا۔ایک فلم اسٹوڈیو میں ان کی شوٹنگ ہونے والی ہے۔اس پر وہ بے حد خوش ہوگئے تھے۔

منتری جی ڈائننگ ٹیبل پر آئے تو سب ان کے آس پاس کھڑے ہوگئے۔اتنے مزیدار کھانوں کی ڈشیں سامنے رکھی تھیں۔میک اپ مین نے ان کے چہرے پر جتنے رنگ لگائے تھے وہ پھولوں کی طرح کھل اٹھے۔

''آپ نے اتنا روسٹ چکن......اتنے کھانے ہمارے لیے کیوں بنائے ہیں......؟''

انہوں نے روسٹ گوشت کی ڈش اپنے سامنے سرکالی۔

''منتری جی......یہ مہنگا گوشت نہیں ہے۔آج کل سب ہوٹل والے گجرات سے گوشت منگوا رہے ہیں۔وہاں سے تازہ گوشت لاکر یہاں بیچ دیتے ہیں۔''ہوٹل کے مالک نے کہا۔

''بے چارے گجرات کے عوام......''منتری جی نے کیمرے کی طرف دیکھ کر روتی

صورت بنائی۔''اپنے گھروں کے پالتو جانور بیچ رہے ہیں.....کیا کریں.....دنگوں نے گجرات کے لوگوں کو بہت دکھ دیئے ہیں۔'' پھر وہ جھک کر ڈش میں سے ایک اچھا بیس نکالنے لگے......

''ارے.....؟ یہ.....یہ کیا ہے.....؟'' منتری جی ڈر کے مارے یوں پیچھے کی طرف مڑ گئے جیسے کوئی خنجر لے کر ان کے سامنے آ گیا ہو......

جلدی سے ان کا باڈی گارڈ آگے بڑھا اور اس نے جھک کر گوشت کی ڈش دیکھی۔

منتری جی کی پلیٹ میں روسٹ کیے ہوئے انسان کے دو ہاتھ رکھے ہوئے تھے...... ایک دوسرے کو تھامے ہوئے.....ایک ہاتھ پر''اوم'' لکھا تھا......

''یہ.....یہ تو انسان کے ہاتھ ہیں.....'' باڈی گارڈ گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔

منتری جی بھی گھبرا گئے۔

منتری جی کی ڈش میں انسان کے دو ہاتھ روسٹ کر کے رکھے گئے ہیں......

یہ سن کر سب پریشان ہو گئے.....ہر ایک منتری جی کی پلیٹ دیکھنے آگے بڑھا...... اسٹوڈیو کے سب آرٹسٹ ہوٹل کا مالک.....کک.....جانے کتنے بے شمار لوگ ڈائیننگ ہال میں گھس آئے۔

''یہاں کئی مرڈر کیس ہوتے ہیں.....دوسرا ہاتھ کسی برہمن کا ہے......''

لوگوں کا شور سن کر ڈائیننگ ہال کا منیجر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔اب پولیس اسٹوڈیو میں آئے گی۔مرڈر کیس میں سب کو پکڑ کے لے جائے گی.....منتری جی سب کو جیل بھیج دیں گے......

''سر.....مجھے گوشت کی ڈش بناتے وقت آج بہت مشکل ہوئی.....میں نے بہت کوشش کی کہ دونوں ہاتھ کاٹ کر الگ کر دوں.....مگر.....مگر......'' کچن کا کک گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''یہ ہندو اور مسلمان کے ہاتھ ہیں.....کاٹنے جلانے سے الگ نہیں ہوں گے۔'' دلیپ سنگھ نے کہا۔وہ ایک پریس رپورٹر کا میک اپ کیے وہاں کھڑے تھے۔پھر انہوں نے ڈر کے مارے کانپتے ہوئے منتری جی سے کہا''منتری جی.....آپ دونوں ہاتھوں کو ایک ساتھ کھایئے۔ بڑا مزہ آئے گا۔''

''مگر یہ کھانے سے منتری جی کو فوڈ پوائزننگ ہو جائے گی۔'' ان کے باڈی گارڈ نے

دلیپ سنگھ سے کہا۔

''نہیں...... منتری جی انہیں ہضم کرلیں گے......''

منتری جی گھبرا کے کھڑے ہو گئے تھے۔لوگ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔

منتری جی کے پیچھے کھڑے ہوئے ڈائریکٹر بھوشن نے اپنے کیمرہ مین کے کان میں سرگوشی کی۔

''ریڈی...... جب منتری جی یہاں سے چلے جائیں گے تو ہم اسی لوکیشن پر شوٹنگ کریں گے۔ان ہاتھوں کے کلوزاپ پر آکاش کہے گا...... یہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک مثال ہے۔ کاٹنے اور جلانے کے بعد بھی وہ ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہیں۔'' آؤ...... ہاتھ ملاؤ......

منتری جی نے بھوشن کی سرگوشی سن لی اور انہیں ایک نیا آئیڈیا مل گیا۔انہوں نے چاروں طرف کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہا'' دیکھو...... یہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک ثبوت ہے، وہ کٹ گئے، جل گئے، مگر یہاں، میری پلیٹ میں ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہیں۔''

''ٹی وی والوں کو بلاؤ...... کیمرہ مین کہاں ہے......؟'' آؤ...... ہاتھ ملاؤ......

پھر انہوں نے میک اپ مین کو اشارہ کیا کہ وہ ان کے منہ پر تھوڑی سی کالک اور مل دے......

☆☆

یہ شہر بکاؤ ہے

یہ شہر بکاؤ ہے—
آیئے— آیئے— جلدی جلدی بولی لگایئے—
پھر نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی—
ہم اپنا شہر بیچ رہے ہیں— ہمارے شہر کو خریدنے والوں کی بھیڑ لگی ہے—
آگے بڑھیے— دوسرے آنے والوں کو راستہ دیجئے—
یہاں آپ کو ہر چیز مل جائے گی جس کی آپ کو ضرورت ہے—
اجی مہاشے —! الیکشن کے جلسے میں جانے سے پہلے تو ضرور اس بازار پر ایک نظر ڈالئے۔
یہاں الیکشن کے لئے ضرورت کی ہر چیز آپ کو مل جائے گی—
آپ کو لیڈر— مولوی— پنڈت— فنڈے— جادوگر— سب مل جائیں گے—
اگر آپ کو بے شمار جوتوں کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو بے بھاؤ پڑ جائیں گے جائیں گے—
میڈیکل شاپ بھی ہیں سرکار— الیکشن میں.......... ہر دہائی بیماری کی دوا جائے گی۔
ادھر دیکھیے— دھرم۔ ایمان۔ اللہ۔ بھگوان۔ رام اور رحیم کا آکشن ہو رہا ہے—
ذرا رکیئے تو مولانا— یہ سودا آپ کو مہنگا نہیں پڑے گا۔
آپ عورت کے ہاتھ سے کتاب چھین کر— اس کے منہ پر نقاب ڈال کر۔ اس کے زبان کھولنے پہ قتل کا حکم دیے بغیر بھی ٹی۔ وی کے ہر چینل پر نظر آسکتے ہیں۔
جی نہیں— ہم اپنا شہر پہلی بار نہیں بیچ رہے ہیں— ہم تو اپنا شہر بار بار بیچتے رہے ہیں۔
کبھی بابر نے خریدا۔ کبھی انگریزوں نے— اس چھینا جھپٹی میں ٹکڑے بکھر گئے ہیں

ہمارے شہر کے —

وہ دیکھئے — دنیا کا سب سے بڑا تاجر بش بھی بہت اونچی بولی لگا رہا ہے —

مگر ہم باہر کے شہروں کو کیوں گھسنے دیں؟ کیا ہمارے پاس لوٹنے والے ڈاکوؤں کی کمی ہے —؟

آپ جو ہیں —— آپ جیسے سیٹھ ساہوکار تو ایک شہر کیا —؟ چاند کے اوپر بھی پلاٹ خریدنے اور بیچنے کی اڈوانس بکنگ کر چکے ہیں۔

ڈالر کا...... بھاوان کے اشارے پہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

اور اسی حساب سے عوام کا معیار میں گر جاتا ہے۔

اگر آپ کو کہیں فرقہ واریت کی آگ بھڑکانا ہے۔ مسجدوں اور مندروں، ہوٹلوں میں بم دھماکے کرنا ہیں تو آپ کو بے شمار ہندو، مسلم بے روزگار بے سہارا نوجوان ہم سپلائی کر سکتے ہیں۔ تنگی کرنے۔ روندڈالنے کے لئے عورتیں۔ فٹ پاتھ کی دوکانیں۔ جھونپڑپٹی کی بستی۔ مسجدوں، مندروں میں عبادت کرتے ہوئے لوگ — سڑکوں پر جانے والے بچے — عورتیں — اس سب کو منٹوں میں جلاڈالنے کا کام ہم کر سکتے ہیں — اس بازار میں ہر چیز بک رہی ہے۔

انصاف، مذہب، تہذیب۔ قانون — اور ان کی لوٹ مار کے ہنگامے بھی ہو جائیں گے۔

یہ دیکھئے — تباہی کے ایسے ہولناک مناظر کہ پورا میڈیا — ٹی۔وی کا ہر چینل وہ دہشت ناک مناظر بار بار دکھائے گا۔

ان ہنگاموں کے خلاف منسٹروں کے وہ بیان بھی ہمارے ہاں تیار ہیں جو وہ ایسے ہنگاموں کے بعد ٹی۔وی پر دیا کرتے ہیں۔

عوام سے لیڈروں کی ہمدردی کے ڈائیلاگس بھی تیار ہیں۔

عوام کو پہلے پتھروں سے مارتے تھے۔ پھر ہتھیاروں سے۔

اب فرقہ پرستی کی آگ پھیلانے کے لئے اس آگ کو عوام کا ایندھن ڈال کر ہی بھڑکا دیا جاتا ہے۔ جی نہیں اب کسی لیڈر کو اللہ اور بھگوان کی ضرورت نہیں ہے۔

اس لئے عوام کی بات سب کرتے ہیں اور مذہب کا بیوپار کرنے والے مولوی پنڈت بھی کرتے ہیں۔

جی — ہم جانتے ہیں سرکار — ہم جیسے لاکھوں آپ کی جیب میں ہیں۔

آپ ہر ایک چیز خریدنے کا کریڈیٹ کارڈ اپنے پرس میں رکھتے ہیں۔

آپ افغانستان کو میں خرید سکتے ہیں اور ایران کو بھی۔ عراق بھی آپ کی جیسے میں ہے یہاں بھی آپ کو ہر چیز مل جائے گی جس کی آپ کو ضرورت ہے۔

یہ اسپیر پارٹس کی دوکانیں ہیں —

وہ دیکھئے — دل — خون — آنکھیں — گردے بیچنے والے غریب لوگوں کی لمبی قطار ہاسپٹل کے سامنے کھڑی ہے —

اور اندر ہاسپٹل کے ڈاکٹر انھیں چیڑ پھاڑ کے خریدنے والوں کے حوالے کر رہے ہیں۔

اب موت حیات اوپر والے کے ہاتھ میں نہیں رہی...... — خریدنے اور بیچنے والوں کے پاس ہے۔ اب ماں — باپ — بیٹا — بیٹی — محبوبہ کمپیوٹر کا بٹن دباتے ہی آپ کے پاس آجائیں گے۔

انسانی بدن کے...... پارٹس کی اس دوکان پر خریدنے اور بیچنے والوں کا رش ہے۔

یہاں انسان کے بدن کا ہر ٹکڑا مل جاتا ہے۔

آپ کو کیا چاہیے — ؟

عورت کا سینہ — ؟ لیڈر کی زبان — ؟ بچوں کے ہاتھ پاؤں — ؟

مزدور کا بدن — ؟ لیڈر کا دماغ — ؟

ہم ہر طرح کا گوشت سارے شہر کو سپلائی کرتے ہیں۔

گورنمنٹ کی ہر پارٹی کا باربی کیو ہم تیار کرتے ہیں —

جی ہاں — وہ سامنے سب شاندار بیوٹی پارلر ہیں۔

آپ جس دن جس میں سیاسی پارٹی میں گھسنا چاہیں،...... آپ منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ میک اپ آپ کو وہاں پر ہر پارٹی کے رنگ میں رنگ سکتے ہیں۔

آپ چاہیں تو ایک پارٹی کا شاعر بن کر کسی منسٹر کی شان میں قصیدہ پڑھیے — اور دوسری پارٹی کا شاعر بن کر اس کی ہجو سناڈالیے اور...... زور زور سے اعلان کیجیے —

ہم کب آتے بھلا فریب میں ہیں۔

تم سے لاکھوں ہماری جیب میں ہیں

ذرا سی دیر میں آپ نہرو جیکٹ پہن کر۔ سر پر ٹوپی، رکھ کر گاندھی جی کے چیلے بن سکتے ہیں۔

اور پھر تیسری پارٹی کی طرف جاتے وقت ہم آپ کو بھگوا کلر میں ڈبو دیں گے۔

ساتھ ہی سب پارٹیوں کے لیڈروں والے ڈائیلاگس بھی تیار ہیں۔

اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔؟

کیا۔۔۔؟ آپ کو ایک تجربہ کار خطرناک مجرم کی تلاش ہے۔۔۔؟ اسے تو آپ پارلیمنٹ کی کرسیوں پر جا کر پکڑ لیجئے۔۔۔اس بازار میں وہ نہیں ملیں گے۔

جی۔۔۔؟ کیا کیا آپ نے۔۔۔؟ آپ کو ایک ایسا آدمی چاہیے۔۔۔بغیر بینائی والی آنکھیں۔

سوچ سے خالی ذہن۔۔۔چیخنے چلانے والا شاندار آدمی چاہیے۔۔۔؟

اچھا۔۔۔! تو آپ کو ایک منسٹر کی تلاش ہے۔۔۔؟ انھیں ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے صاحب؟

آج کل تو عوام سے زیادہ ہمارے منسٹر ہیں۔ اب منسٹر بننے میں کوئی مشکل نہیں رہی صاحب۔

شاید آپ الیکشن میں کھڑے ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔۔۔!

تو پھر اس طرف جایئے آپ۔۔۔وہاں ہر پانچ برس کے بعد الیکشن ہوتا ہے۔ وہاں آپ کسی بھی پارٹی کا لیڈر اپنی پارٹی کے لئے خرید سکتے ہیں۔۔۔

آج کل وہاں بھی ری ڈیکشن سیل چل رہا ہے۔۔۔

ذرا سنئے۔۔۔وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔۔۔ان کا بھاشن تو سن لیجئے۔۔۔

"۔۔۔آپ نے پہلے ہماری پارٹی کو ووٹ دیا تھا؟

میرے دادا اسی شہر سے کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ غریبوں کو گھر دیں گے۔ دو روپے کلو چاول دیں گے، پانی، بجلی کی کمی، مہنگائی کو ختم کر دیں گے۔

گاؤں کی جھونپڑیاں ہٹا کر ایک نیا گاؤں بنا دیں گے۔

میرے پتاجی نے بھی آپ سے یہی وعدہ ... اور الیکشن جیت گئے تھے۔

میں بھی آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ الیکشن جیتنے کے بعد ساری جھونپڑیاں ٹوٹے

چھوٹے مکان ہٹا کر یہاں شاندار بلڈنگیں بنادوں گا۔آپ سب ان ٹوٹے پھوٹے گھروں سے نکال دیے جائیں گے۔

(تالیاں)

ایک نظر ادھر بھی—

ذرا دیکھئے—اس بازار میں ہر چیز بک رہی ہے۔

اس شوکیس میں نوعمر لڑکیوں کا تازہ اسٹاک آیا ہے۔ابھی جو شہر میں بم دھماکے ہوئے وہاں سے منگوائی گئی ہیں۔

دور کیوں کھڑے ہیں— آگے آیئے حضور—

جی ہاں— آج کل میڈیا نے عورت کے کپڑے اتار دیے ہیں— قریب جایئے—

عورت—جانور—ڈھول—یہ سب مار پیٹ کر ٹھیک کر جاتے ہیں—

اگر آپ کو اپنے لئے باپ چاہیے—بیوی کے لئے شوہر—بچے کے لئے باپ کی ضرورت ہے تو یہاں ہر کردار ادا کرنے والے ایکٹر موجود ہیں۔

ہمیں ان سب کو ختم کرنا ہے جو ابھی تک سچ بولتے ہیں۔انسانوں کے بیچ نفرت کی دیوار نہیں اٹھاتے......مذہبی راہنما—سیاسی لیڈر—یہ کردار ادا کرنے والے یہاں مل جائیں گے۔

اگر آپ روزگار چاہتے ہیں تو اس......—ہر پوسٹ کے لئے اپلائی کر سکتے ہیں مذہبی راہنما جیوتشی—لیڈر—خدا اور بھگوان کے لئے اب بہت کم نوجوان اپلائی ء کرتے ہیں بڑا جھنجھٹ ہے نا اور اب خدا کی مسند پر بیٹھ کر ساری دنیا ہر پر خدائی کرنے کا اختیار بُش نے لے لیا تھا—ہم اپنی ہر چیز بش کے ہاتھوں بیچ چکے ہیں۔

ہمارا کلچر—عزت—ہمارے سارے اچھے ہنر مند نوجوانوں کو خریدنے کے لئے امریکہ کے دن ڈالر شاپ پر نوجوانوں کی قطار لگی ہے۔

اگر آپ ہمارے شہر کو خریدنے کی قیمت لے کر نہیں آتے ہیں تو ہمارے شہر کو دہن کو لیجئے—

ہم اپنا شہر کئی بار بیچ چکے ہیں—راجوں مہاراجوں کے پاس—فرنگی لیٹروں کے پاس— آج بھی ہر پانچ برس بعد اس شہر کا الیکشن ہوتا ہے۔

جی ہاں—یہاں ایک ٹریننگ کالج بھی ہے جہاں لیڈر بننے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

لیکن فیس بہت زیادہ ہے— آپ کو ایک فارم دیا جاتا ہے۔

اس فارم میں لکھنا پڑتا ہے۔

عمر——؟

قابلیت کے سرٹی فیکٹ کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلے کبھی لیڈر بنے تھے——؟ بنے ہو تو کس کس پارٹی میں کتنے دن رہے—؟

اب تک کتنے قتل کیے ہی—؟

کس پارٹی کی لیڈر شپ کتنے دنوں کے لئے چاہیے—!

اس پیپر پر سائین کرو کہ ہمارے بنائے ہوئے پروگرام پر عمل کرو گے۔

اس لیڈر شپ کو چھوڑنے سے پہلے کسی بڑی چور کے اس کام میں حصہ لو گے۔

آدھا مال ہمارا ہوگا—

اپنی منسٹری کے کسی کام سے کوئی واسطہ نہیں رکھو گے—

جی—؟ کیا کہا آپ نے—؟

آپ لیڈر بننا نہیں چاہتے—!

اچھا—؟ تو آپ ایک ادیب، ایک فن کار کو خریدنے کے لئے آتے ہیں—؟

ٹھہریئے— آگے مت جایئے—وہاں ادیب، موسیقار— فن کار رہتے ہیں۔

وہ نہ کسی کی جیب میں جاتے ہیں اور نہ کسی کی جھولی میں گرتے ہیں۔

انھیں خریدنے کے لئے تو سیاسی لیڈر بھی آتے ہیں اور مذہبی راہنما بھی—

وہ سب اپنی سی کر کے ہار گئے—

آپ بھی رک جایئے—

اُدھر— دیکھئے— میڈیا ایک کو ہیرو بنا کرٹی۔وی کے ہر چینل پر ان کے دن رات کا ہم پروگرام دکھا رہی ہے۔آج انھوں نے کیا کھایا؟ ان کا موڈ کیسا رہا—؟ آپ بھی اس شہر کو خریدنے کے لئے بولی لگایئے۔

ایک—دو— تین—

اسے کس نے مارا؟

''اسے کس نے مارا؟''

''کیا عورت اپنے آپ کبھی نہیں مرتی۔ ہمیشہ اسے کوئی اور مارتا ہے؟''

''پھر آپ یہ بات ہم سے کیوں پوچھ رہے ہیں انسپکٹر صاحب......؟''

''سڑکوں پر بھیک مانگنے والی ایک آوارہ چھوکری کیسے مرگئی؟ آپ Investigation کرنے آئے ہیں؟ ساری کالونی کے شریف لوگوں کو اکٹھا کرلیا ہے؟''

''انسپکٹر صاحب......؟ اللہ کے فضل سے اس کالونی میں سب تعلیم یافتہ مہذب لوگ رہتے ہیں۔''

وہ سڑکوں پر ننگی پھرنے والی آوارہ چھوکری تھی۔ بھیک مانگتی تھی۔ اس کا کوئی گھر تھا نہ کوئی رشتے دار تھا۔ کل رات شاید کالونی کے آوارہ لونڈے اس پر ٹوٹ پڑے ہوں گے۔ پھر اسے گھسیٹ کر یہاں فٹ پاتھ پر پھینک گئے۔

آپ ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ اسے کس نے مارا؟''

''میں نے صرف ایک بار اسے ڈنڈے مار کے گیٹ کے باہر کردیا تھا۔''

''میں نے تو اسے جانے کتنی بار باہر نکالا۔ ہر وقت روٹی مانگنے آجاتی تھی۔''

''انسپکٹر صاحب میں تو اسے اپنے گھر کے پاس بھی نہیں آنے دیتی تھی۔''

''لان میں کتے کے لئے کھانا رکھو تو وہ بھی کھا لیتی تھی۔''

''اور ممی۔ وہ کوڑے کے ڈھیر پر سے کیلے اور آم کے چھلکے اٹھا کر چاٹ لیتی تھی۔''

''منی......تو چپ......گندی باتیں مت کر۔''

''یہاں سب بڑے اہم لوگ رہتے ہیں۔ بھلا اس گندی بھکارن چھوکری کا قتل کون

کرے گا؟ میں ایک پروفیسر ہوں۔ میرا ان باتوں سے کیا کام ہے؟''

''بے شرم تھی سالی۔ ننگی پھرتی تھی۔ مسجد سے نماز پڑھ کر نکلو تو اسے دیکھ کر وضو ٹوٹ جاتا تھا۔ لاحول ولا۔ اسی لئے تو عورت کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنا چہرہ چھپائے رکھو۔''

''بچارے مردوں کی جنسی خواہش نہ بھڑک اٹھے۔''

''رات کو سب۔ کون بنے گا کروڑ پتی؟ دیکھ رہے تھے اور وہ دروازہ پیٹ کر چلا رہی تھی روٹی دو۔ روٹی دو۔''

''میں نے کتنی بار اپنے بچوں کو روکا۔ اس کے پاس مت جاؤ۔ کوئی روگ لگ جائے گا۔ مگر وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ ناچتی گاتی تھی۔''

''میری بے بی سب سے چھپا کر اسے روٹی دے آتی تھی۔''

''ایک بار اس کے سر میں سے خون نکل رہا تھا تو بے بی اس کے لئے دوا لے کر بھاگی تھی۔''

''بڑی چالاک تھی سالی۔ پاگل پن کی ایکٹنگ کر کے سب کو اپنے پاس بلا لیتی تھی۔''

''ایک دن اس کی ٹانگ بھی زخمی ہو گئی تھی تو زمین پر ہاتھ ٹیک کر چلتی تھی۔''

''ہوسکتا ہے کل رات بھی چھوکروں نے اس کا منہ کالا کر کے سڑک پر پٹک دیا ہو۔''

''ہوسکتا ہے کسی کار نے اسے روند ڈالا ہو۔ رات کو کالونی کے بہت سے لوگ کلب میں آتے ہیں تو مدہوشی میں کار کے ایکسڈنٹ ہو جاتے ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب؟ آدمی رات کو کسی عورت کے رونے چلانے کی آواز آئے تو ہم باہر جا کر دیکھیں کہ کیا ہوا ہے؟''

''مہاشے جی۔ یہاں تو ساری رات کے پکڑ دھکڑ کھیل چلتے رہتے ہیں؟''

''رات اتنی زور کی بارش ہو رہی تھی اور وہ گیٹ پر زور زور سے پتھر مار رہی تھی۔ بڑی مشکل سے گارڈ نے اسے مار کے بھگایا۔''

''انسپکٹر صاحب...... وہ لڑکی ہندو تھی اور ایک مسلمان کے گھر کے سامنے اس کا قتل ہوا ہے؟''

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ سے کس نے کہا کہ اس کالونی کے مسلمان ہندو آپس میں لڑتے ہیں؟ توبہ توبہ اللہ ہمارا دین ایمان سلامت رکھے۔

''سڑک پر ننگی پھرنے والی چھوکری سے ہمارا کیا واسطہ؟''

''صاحب ہم برہمن لوگ ہیں۔وہ اچھوت جات کی چھوکری کون ہے۔کدھر سے آئی کیسے مرگئی۔ہم کو کچھ نہیں معلوم۔مندر کے سامنے سے ہم اسے ہٹا دیتے تھے۔''

''اب تو آپ کو یقین ہوگیا نا کہ اس کالونی میں اس بھکارن چھوکری کو کسی نے قتل نہیں کیا ہے،اس کا قاتل کون ہے؟ چلئے ہم بھی آپ کے ساتھ مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔انسپکٹر صاحب ......ادھر دیکھئے۔''

''بھکارن کی لاش کے پاس ایک بوڑھی عورت آگئی ہے؟ زور زور سے رو رہی ہے وہ......؟

''نہیں۔وہ اس کی ماں نہیں ہے۔اس کا تو کوئی بھی رشتے دار کبھی نظر نہیں آیا؟''

''آپ نہیں جانتے مولانا اب اس کاریاکرم نے اور لاوارث کے دعوے دار بہت سے آجاتے ہیں۔اب وہ آپ سے بھی چندہ وصول کریں گے۔گورنمنٹ بھی کچھ دے گی۔''

''ساری کالونی اس بڑھیا کو روپے دان کریں گے کیونکہ وہ مرنے والی کی ماں بن جائے گی۔''

''ممی......میری بات سنیے......'' بے بی نے چلا کر اپنی ممی سے کہا۔

''وہ بڈھی کہہ رہی ہے وہ بھکارن کی ماں نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا......''پھر تم کون ہو؟''

تو وہ روتے روتے کہہ رہی ہے۔

''مرنے والی اکیلی سڑک پر پڑی ہے۔اس کی موت پر رونے والا کوئی نہیں ہے۔''

''اس لئے میں رو رہی ہوں۔''

☆☆

جنت کی تلاش

''سلام علیکم مولوی صاحب—''

سب بچے مولوی صاحب کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔

''مولوی صاحب آج میں نے اللہ میاں کو خط لکھا ہے کہ وہ ہمارے ابا کو بہت سے روپے بھیج دیں'' مُنّی نے خوش ہو کر مولوی صاحب سے کہا۔''

''اللہ میاں کو خط نہیں لکھتے ہیں بیٹی۔'' مولوی صاحب نے مُنّی کو سمجھایا۔

''کیوں—؟ کیا اللہ میاں کو بھی اردو پڑھنا نہیں آتی ہے؟

مُنّی نے تعجب سے پوچھا—

سڑکوں پر بھیک مانگنے والے۔ مزدوری کرنے والے جھونپڑیوں میں رہنے والے بے سہارا بچوں کو مولوی صاحب مسجد کی آنگن میں بیٹھا کر مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔

اللہ میاں سے دعا مانگو اللہ میاں تمہاری دعا سن لیں گے۔

''بابا—اندھا..........ہوں۔ ایک روپیہ دیدو۔ اللہ آپ کو ہزار روپے دے گا'' مسجد کے دروازے پر کھڑا ایک بوڑھا فقیر چلاّ رہا تھا۔

''مولوی صاحب— کیا اللہ میاں اس بھکاری کی دعا سن لیتے ہیں۔ ایک بچے نے مولوی صاحب سے پوچھا۔

''تو وہ بھکاری اپنے لئے اللہ میاں سے ہزار روپے کیوں نہیں مانگتا؟ بچوں کے ان سوالوں سے مولوی صاحب گھبرا گئے۔ انھوں نے، سب کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔

''بکواس بند کرو— کل میں نے تم سے کیا کہا تھا—؟

نماز پڑھا کرو— جھوٹ مت بولو— چوری مت کرو۔''

''وہ مولوی صاحب — منّی جھوٹ بولتی ہے — 'لیک لڑکے نے منّی کو سامنے دھکیل دیا
''اوراس نے کل دوکان پر مٹھائی چرا کے کھائی تھی ۔''
''تو کیا اللہ میاں مجھے اس وقت دیکھ رہے تھے — ؟منّی نے گھبرا کر کہا۔
''ہاں۔اللہ میاں ہر ایک کو دیکھتے ہیں۔ ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔''مولوی صاحب نے منّی کو سمجھایا۔
''اچھا — ؟''منّی کے پاس بیٹھے ہوئے شاکر نے تعجب سے مولوی صاحب کو دیکھا۔
''اللہ میاں اتنے بہت سے کام کیسے کرتے ہیں — ؟''
''اسکول سے آنے کے بعد تو مجھ سے ہوم ورک بھی نہیں ہوتا۔ ٹیچر سے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے بخار آ گیا تھا۔شاکر پاس بیٹھے دوستوں سے کہنے لگا۔
سب بچے ہنسنے لگے۔ مگر مولوی صاحب نے سب کو ڈانٹ دیا۔
''خاموش — بدتمیز —
''اگر تم جھوٹ بولو گے۔ چوری کرو گے تو اللہ میاں تمہیں دوزخ میں ڈال دیں گے۔''
مولوی صاحب نے ڈراونی صورت بنا کر بچوں کی طرف دیکھا۔
سب بچے بھی ڈر گئے۔ منّی اور شاکر بھی گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔
''دوزخ میں کیا ہوتا ہے — ایک اور بچی نے منہ کھول کر پوچھا۔
''دوزخ بہت بری جگہ ہے۔''مولوی صاحب نے ڈراونی صورت بنا کر.......... کر اس طرح کہنا شروع کیا بچے ڈر جائیں۔
''جو لوگ برے کام کرتے ہیں۔چوری کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں۔اللہ میاں انھیں دوزخ میں ڈال دیتے ہیں۔''
دوزخ کہاں ہے مولوی صاحب۔ایک بچے نے گھبرا کے پوچھا۔
''دوزخ اوپر آسمان پر ہے۔ وہاں اندھیرا ہوگا — بھوک لگے گی مگر کھانا نہیں ملے گا۔ پینے کو پانی نہیں ہوگا۔سانپ بچھو کاٹنے کو آئیں گے — بچھانے کو بستر ملے گا نہ اوڑھنے کو چادر ملے گی۔''

مولوی صاحب ڈراونی شکل بنا کر بچوں کو دوزخ کا حال سنا کر ڈرا رہے تھے سب بچے ڈر کے بارے ایک دوسرے کے قریب آ کر مولوی صاحب کی باتیں سن رہے تھے۔ پھر بچے اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں تو دوزخ میں کبھی نہیں جاؤں گا۔'' ایک چھوٹی سی لڑکی منّی کے پیچھے چھپ گئی۔ مگر منّی نے اس کا ہاتھ تھام کر سمجھایا۔

''ارے رضیہ۔؟ تو کیوں ڈر رہی ہے؟ مولوی صاحب کو نہیں معلوم ہے۔ دوزخ آسمان پر نہیں ہے۔ منّی نے رضیہ کو تھام لیا۔

''اچھا—؟ میں جھوٹ بول رہا ہوں—؟ مولوی صاحب کو غصہ آ گیا۔

''تو پھر دوزخ کہاں ہے—؟ تجھے معلوم ہے—؟

''ہاں مجھے معلوم ہے—؟ منی نے مولوی صاحب کی اٹھی ہوئی چھڑی سے بچتے ہوئے کہا۔

''آپ میرے ساتھ چلو—میں آپ کو دوزخ میں لے جاؤں گی—''

''کیا بک رہی ہے تو—؟ مولوی صاحب کو غصہ آ گیا۔ وہ انھوں نے باقاعدہ چھڑی اٹھالی۔

''اتنی سی چھوکری—میرا مذاق اڑا رہی ہے۔؟ تو مجھے دوزخ میں لے جائے گی—؟ مولوی صاحب کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر منّی ڈر کے مارے اپنی سہیلی کے پیچھے چھپ گئی اور پھر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر روتے ہوئے بولی۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں مولوی صاحب۔ جنگم بستی میں ہماری جھونپڑی دوزخ میں ہے۔ رات کو جب ہمارا ابا واسینڈھی پی کر آتا ہے۔ اماں کو مارتا ہے تو اماں روتے روتے بولتی ہے۔ یہ گھر تو دوزخ ہے۔''

''اچھا—تو تیری اماں بولتی ہے کہ تیرا گھر دوزخ میں ہے—؟''

''ہو مولوی صاحب۔ ہمارا گھر بھی دوزخ میں ہے— آپ بولئے نا دوزخ میں اندھیرا ہوگا۔ کھانا پانی نہیں ملے گا—؟ ہمارے گھر میں بھی لائٹ نہیں ہے۔ چراغ میں تین نہیں ہوتا تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔''

''اور ہمارے گھر میں پانی بھی دور سے لانا پڑتا ہے۔ رات کو پانی ختم ہو جاتا ہے۔''

ایک اور بچے نے کہا۔

''رات کو بھی ہمارے ابا چاول نہیں لاتے تھے تو اماں خالی ہانڈی میں پتھر ڈال کر جھوٹ بولتی ہے کہ کھانا پک رہا ہے۔'' ایک بچہ رونے لگا۔

بچوں کی باتیں مولوی صاحب غور سے سننے لگے۔

''اسی لئے ہماری دادی گاؤں سے نہیں آتی۔ بولتی تمہارے گھر میں اوڑھنے کو آسمان بچھانے کو زمین ہے۔'' سب بچے ہنسنے لگے۔

''اور بارش ہوتی تو ہماری جھونپڑی میں پانی آجاتا ہے۔''

''رات سانپ بھی نکلا تھا۔''

بچوں کی باتیں سن کر مولوی صاحب کا سر جھک گیا۔

اب کون سا عذاب ہے جس سے ان بچوں کو ڈراؤں میں ــــ؟

اچانک مسجد کے باہر شور ہونے لگا ــــ لوگوں کے رونے چلّانے کی آوازیں ــــ فائرنگ کا شور ــــ چاروں طرف لوگ بھاگ رہے تھے۔ بے ہنگم ٹریفک نے راستے بند کر دیے تھے۔

کسی شاندار ہوٹل میں بم پھٹا تھا۔

اس کے پیچھے مزدوروں کی بستی میں آگ لگی تھی۔

ہر طرف آگ کے شعلے نظر آ رہے تھے۔

مولوی صاحب کے ساتھ چلنے والے بچے اسی بستی سے آئے تھے۔

شاید ان بچوں کے گھر بھی جل رہے تھے۔

بچے ڈر کے مارے رونے لگے۔ مولوی صاحب بھی ان بچوں سے پیچھا چھڑا کے کہیں بھاگ جانا چاہتے تھے۔ مگر پولس نے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔

سب بچے ڈر کے مارے مولوی صاحب سے نپٹ گئے تھے۔

''مولوی صاحب ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔''

''اب ہم گھر کیسے جائیں گے۔''

''مولوی صاحب— کیا آج دوزخ سڑکوں پر آگئی ہے—''

''مولوی صاحب۔آپ ہمیں پھر دوزخ کی طرف کیوں لے جارہے ہیں جنت کی طرف چلئے نا—''

بچوں کے سوالوں سے گھبرا کے مولوی صاحب ان بچوں کو اپنے ہاتھوں میں چھپاتے ایک کونے میں کھڑے تھر تھر کانپ رہے تھے۔

یا اللہ تو نے ان بچوں کے لئے دوزخ تو زمین پر اتار دی ہے۔

جنت میں لے جانے کا وعدہ حشر کے دن پر کیوں ٹال دیا ہے—؟

مجھے وہ راستہ بتا دے کہ میں ان بچوں کو جنت میں لے جاؤں—

☆☆

موت کے بیج

بدؔلولان کی اس گھاس کی طرح تھا جو سر اٹھانے پر کچل دی جاتی ہے۔

مگر آج سورج نکلنے سے پہلے بدؔلو نے ایک خبر سنا کہ پورے گاؤں میں اُجالا پھیلا دیا تھا۔

''روشن میاں ہمارے گاؤں آرہے ہیں۔ایٹمی انرجی کے مشہور سائنٹسٹ......کل وہ ٹی وی پر پریس والوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ ایٹمی تاب کاری کا ایک تجربہ کرنے اس گاؤں میں آرہے ہیں۔''

اتنے بڑے سائنٹسٹ جن کا نام سارے ہندوستان میں مشہور ہے......وہ کل یہاں آئیں گے؟ گاؤں والوں کو یقین نہیں آرہا تھا...... بڑے لوگوں کا ہر وعدہ کل کے لیے ہوتا ہے۔ کچھ دینے کی بات آج خدا کرتا ہے نہ لیڈر......

وہ ہمارے روشن میاں ہیں۔میں شہر میں ان کے گھر میں رہتا تھا......

جب بدؔلو کی باتوں پر اس کے دوستوں کو یقین نہ آیا تو وہ انہیں ایک ٹیلی فون بوتھ پر لے گیا اور روشن میاں سے بات کی۔

''ہیلو، ہیلو، ہیلو......روشن میاں۔میں بدؔلو بات کر رہا ہوں، اپنے گاؤں سے۔آداب۔ میں بدرالدین۔کل آپ ہمارے گاؤں آرہے ہیں ناں: کوئی تجربہ کرنے۔تو روشن میاں اپنے ساتھ اناج کے ایسے بیج بھی لائیے، کھیتی باڑی کا کوئی نیا کام سکھائیے کہ پوکھران کی سوکھی ریت پر کھیت لہلہانے لگیں......''

اس نے فون رکھ کر گاؤں والوں کی طرف بڑے فخر کے ساتھ دیکھا......

جب بھی کسی نیوز پیپر میں روشن علی کا نام آتا تھا تو بدؔلو خوشی سے اُچھل پڑتا تھا۔

''یہ ہمارے روشن میاں ہیں......'' وہ گردن اٹھا کر کہتا تھا۔

جب بدلو چھوٹا سا تھا تو اپنے ماں باپ کے ساتھ روشن میاں کے گھر کا کام کرتا تھا۔ پھر جب بدلو کا باپ روشن میاں کے بوڑھے باپ کی خدمت کرتے کرتے بیمار پڑ گیا...... اس کی ماں گھر کی خدمت کرنے سے تھک گئی تو بیگم صاحب نے ایک دن کہا ''اب تم دونوں اپنے گاؤں جاؤ۔ اپنے کھیت زمین سنبھالو۔ اور بدلو کو بھی لے جاؤ۔''

''ہمارے کھیتوں میں تو ریت بھری بیگم صاحب۔ کتنی محنت کی مگر کچھ نہیں اُگتا۔

''اور بدلو کو تو اپنے پاس رہنے دو بیگم صاحب......'' اس کی ماں نے کہا۔

''روشن میاں کے ساتھ رہ کر دو حرف پڑھ لے گا۔''

''اچھا......؟'' بیگم صاحب نے بڑے غرور سے بدلو کو دیکھا......

''اچھا......؟ تو کیا بدلو بھی اسکول میں پڑھ کر میرے بیٹے کی طرح سائنٹسٹ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے!''

''نہیں بیگم صاحب...... جو کام بدلو کے باپ دادا نے کیا ہے وہی اسے بھی کرنا۔ ہے باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

مگر گاؤں آکر بدلو صبح سویرے اسکول کی طرف بھاگتا تھا۔

راتوں کو چراغ کی روشنی میں پڑھتے پڑھتے جانے اس نے کتنا تیل جلا ڈالا!

اس کی ماں بیٹھی چلاتی رہی۔ پانچ میل دور...... ریت کے ٹیلوں کو پار کر کے وہ صبح اسکول کی طرف بھاگنے لگا۔

پھر جب دسویں کلاس میں پاس ہونے کا نمبر اخبار میں چھپا تو اس کی ماں نے سارے گاؤں کو یہ خبر سنائی اور اس کا باپ اپنے دوستوں کو شراب خانے لے گیا۔

''بس۔ بہت ہوگئی پڑھائی۔'' اس کی ماں نے کہا...... ''میں تجھے اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گی۔ روشن میاں سے کہوں گی تجھے کسی کام سے لگا دیں۔''

مگر بدلو شہر نہیں گیا...... ایگری کلچر ڈپارٹمنٹ سے اس نے ٹریننگ کا کوئی کورس کر لیا۔

مگر اناج بونے اور اچھی فصل کے لیے یہ پڑھائی بھی اس کے کام نہ آئی۔

ریت کے ٹیلوں پر صرف خاک اڑا کرتی تھی۔

اور اب روشن علی ان کے گاؤں آرہے تھے......

سارے گاؤں میں دھوم مچی تھی۔

''وہ ہمارے روشن میاں ہیں......''بدلو بڑے فخر کے ساتھ سب کو سنا رہا تھا۔

''انہوں نے ایسا ایٹم بم بنایا ہے کہ منٹوں میں دشمن کے ملک کا صفایا ہو جائے......''

(ان کے ساتھ اور بھی سائنٹسٹ ہیں اس بات کو بدلو نہیں مانتا تھا)

''دادو......دشمن کا پورا شہر مٹ جائے گا۔''

''اچھا......؟''دادا میاں نے گھبرا کے منہ کھول دیا۔

''تو پھر روشن میاں کہاں رہیں گے......؟''

''دادا......وہ ایٹم بم تو دشمن کے لیے ہے......''بدلو نے دادا میاں کو سمجھایا۔

''کیا پتا......؟ ہمارے دشمن کے گاؤں میں بھی کوئی روشن میاں جیسا آدمی پیدا ہو گیا ہو......؟''

''ارے......؟ یہ بات ہم نے کیوں نہیں سوچی......؟''بدلو دادا میاں کی بات پر گھبرا گیا۔

مگر گاؤں والے ہنسنے لگے۔دادا ہمیشہ اُلٹی بات سوچتے ہیں......

بدلو کو یاد تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کب شہر سے گاؤں آیا تھا۔

جب وہ چھوٹا سا تھا تو روشن میاں کالج جاتے تھے۔بدلو ان کے جوتوں پر پالش کرتا تھا۔

وہ دوستوں کے ساتھ لان میں ٹینس کھیلتے تھے تو بال اٹھا کر انہیں دیتا......صبح سویرے ان کی کار صاف کرتا، پھر ان کے کمرے کی صفائی بہت احتیاط سے کرنا پڑتی......

کمپیوٹر کے کل پرزے......تار چاروں طرف پھیلے رہتے تھے......وہ کمپیوٹر کے سامنے کان پر مائیک لگائے دن رات بیٹھے رہتے تھے۔

بدلو کو اپنے بچپن کی وہ بات بھی یاد تھی جب روشن میاں نے مذاق میں اسے سکھایا تھا کہ زمین پر ایک چونی گاڑھ دو تو روپے کا پیڑ اُگ جاتا ہے......

بدلو سچ مچ زمین میں چونی گاڑھ کر روپے کا پیڑ اگنے کا انتظار کیا کرتا تھا......

بار بار پوچھتا......''روشن میاں روپے کا پیڑ کب اُگے گا......؟ اس میں کتنے روپے لگیں گے......؟''وہ آج بھی پوکھران کی زمین پر دانے ڈال کر ہری بھری فصل اگنے کا انتظار کرتا ہے

......اب وہ پھر روشن میاں سے پوچھے گا یہی بات۔

صبح سویرے سارے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔

ریڈیو، ٹی وی والے بھی آگئے اور نیوز رپورٹر بھی......

پھر جیسے کاروں کی قطار لگ گئی۔اور کیمروں کی روشنی میں جگمگاتے روشن میاں کو بدلو نے پہچان لیا......وہ کتنے بھاری بھر کم ہو گئے تھے۔گردن اونچی کیے نیوز رپورٹر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

بدلو کے ماں باپ بڑی مشکل سے ان کے قریب پہنچے اور ان کے پاؤں چھوئے......

''کیسے ہو تم لوگ......'' انہوں نے بھی دونوں کے پاؤں چھوئے، گلے سے لگالیا۔پھر بدلو کو دیکھا تو خوش ہو گئے۔

''ارے بدلو......؟ تو اتنا بڑا ہو گیا......؟ کچھ عقل آئی یا ابھی تک زمین میں چونی گاڑھ کر روپوں کے پیڑ کا انتظار کرتا ہے......؟''

سب ہنس پڑے......مگر بدلو نے سنجیدگی سے کہا'' روشن میاں......میں تو آج بھی پوکھران کی بنجر زمین پر بیج ڈال کر ہری بھری فصل اگنے کا انتظار کرتا ہوں۔آپ اچھی فصل اگانے کی بھی کوئی ترکیب بتائیے نا......''

''یہ لو میاں......پہلے منہ میٹھا کر لو۔میں نے گڑ کی پوریاں بنائی ہیں تمہارے لیے......''

بدلو کی ماں نے مٹی کی رکابی میں انہیں پوریاں پیش کیاں۔

اتنے ہجوم میں ٹی وی کے کیمروں کے سامنے روشن علی نے جلدی جلدی پوریاں کھائیں۔

''یہ تو مجھے بہت پسند ہیں۔بی بی میں امریکا میں بھی تمہاری پوریاں یاد کرتا تھا......''

گاؤں کے سب لوگ خوش ہو گئے......

گاؤں میں ڈھول تاشے بجنے لگے۔سب تالیاں بجا کر ناچ رہے تھے۔

گاؤں کے اندر جانے سے پہلے روشن علی مندر کے سامنے رک گئے۔

ہاتھ اٹھا کر نمستے کیا۔مندر کے پجاری نے پرساد دیا۔آشیرواد دیا......

مسجد کے آگے مؤذن صاحب نے روک کر دعائیں پڑھیں۔ان کے مشن کی کامیابی

کی دعا کی۔ایک بوڑھی عورت لاٹھی کا سہارا لیتی آگے بڑھی۔

''جگ جگ جیو بیٹا..... ہم نے سنا ہے تم نے بہت بڑا ایٹم بم بنایا ہے.....؟''

''میں نے نہیں ماتا جی..... ہم سب نے مل کر بہت بڑا کام کیا ہے.....''

''اس بم کا کیا کرو گے بیٹا.....''بڑھیا کے سوالوں سے سب بور ہو گئے اور ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھو.....

''ماتا جی..... جب ہم دشمن پر وہ بم پھینکیں گے تو منٹوں میں ان کا سارا ملک تباہ ہو جائے گا۔''

''سارا ملک.....؟''بدلو نے حیران ہو کر روشن علی کو دیکھا۔

''تو کیا کھیت بھی جل جائیں گے اور کھیتوں پر آنے والی چڑیاں بھی مر جائیں گی؟''

روشن علی نے بدلو کی گھبرائی ہوئی صورت دیکھی تو ہنس کر کہا''تو کیوں گھبرا گیا ہے بدلو..... تو نے زمین میں چونی بوئی ہے۔اب روپے کا پیڑ اگنے کا انتظار کیے جا..... یہ بم تو تیرے دشمنوں کے لیے ہے.....''

روشن علی بہت زور سے ہنسے۔ان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا بریف کیس تھا۔جب ٹی وی کیمروں نے ان کی ٹیم کو گھیر لیا تو انہوں نے اپنا بریف کیس بدلو کو دیا۔

''سنبھال کے رکھنا۔میرے ساتھ رہو۔اس میں پروجیکٹ کا پورا پلان ہے.....''

پھر ان کی ٹیم کے اور لوگ بھی آ گئے۔ایک جلوس کی طرح وہ سب ریت کے ٹیلوں کو پار کر کے پہاڑی پر پہنچ گئے۔

وہاں ایک ڈائس بنایا گیا تھا..... روشن علی وہاں کھڑے ہو گئے.....

ایک ٹی وی رپورٹر اُن کا انٹرویو لینے کے لیے آگے بڑھا۔

انہوں نے اپنا بریف کیس کھولنا چاہا..... اِدھر اُدھر دیکھا.....

''میرا بریف کیس کہاں ہے.....؟ابھی میں نے بدلو کو دیا تھا.....؟''

سب اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے..... بدلو کہاں گیا.....؟

ڈائس سے بہت دور چھوٹی سی ندی کے کنارے،وہ ایک پیڑ سے ٹیک لگائے،آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہا تھا.....

روشن علی پوکھران کی ریت کے پھیلے ہوئے صحرا کو دیکھ رہے تھے۔

''خدا کی طرح...... چند سیکنڈ میں اس سارے منظر کو مٹا دینے کا اختیار ہے میرے پاس...... بریف کیس میں......''

لوگ زبردستی بدؔلو کو گھسیٹ کر لے آئے......

''میرا بریف کیس کہاں ہے......؟'' روشن علی نے گھبرا کے پوچھا۔

''وہ تو میں نے ندی میں پھینک دیا......'' ڈر کے مارے کانپتے ہوئے بدؔلو نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ہرے بھرے کھیتوں کو ختم کرنے والے موت کے بیج آپ ہمارے گاؤں میں کیوں لے آئے......؟''

روشن علی نے غور سے خوف کے مارے کانپتے ہوئے بدؔلو کو دیکھا......اور چکرا کر گر پڑے......اور پھر انہیں بہت پرانے اخبار کی ایک نیوز یاد آئی......

ایٹم کا دل چیرنے والے پہلے سائنٹسٹ اوپن ہائمر نے کہا ''میں نے پہلی بار ایٹم بم کی تباہی دیکھی تو خوف کے مارے رونے لگا، میں موت بن گیا ہوں۔ دنیا میں آنے والے بچوں کا قاتل ہوں۔'' اور پھر اس نے خودکشی کر لی۔

میڈیا کی چکا چوند میں گھرا وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا ہے......

کیا میں ندی میں کود کر وہ بریف کیس نکال لوں......؟

یا خود بھی ندی میں ڈوب جاؤں......؟

اب روشن علی کیا کرے گا......؟

آپ ہی بتایئے کہ میں اس کہانی کو کیسے ختم کروں......؟

☆☆

کیا ٹوٹ گیا—؟

یہ ٹکڑے کس کے ہیں—؟
کیا ٹوٹ گیا—؟
دل کے ٹوٹنے کی آواز تو سنائی نہیں دیتی—؟
درد کی ٹیسوں کی تو کوئی آواز نہیں ہوتی—؟
آنسوں کی دھار کا شور تو سنائی نہیں دیتا—؟
اِدھر اُدھر دیکھا—
جانے کیا ٹوٹ گیا ہے—؟
اِدھر اُدھر دیکھا—
اس گھر میں ہر چیز ٹوٹ چکی ہے—
برتن—رشتے—دل—امیدیں—
سب کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں—
کیا میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے—؟
یہ ایٹمی تباہ کاری کی آخری..........—؟ چیخ تھی—؟
کیا سورج ٹوٹ گیا—؟
آکاش کے ٹکڑے بکھر گئے—
مجھے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی—
جیسے کسی ساز کی آواز تھی جو چوٹ کھا کے گنگنانے لگتا ہے۔
میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا—

جب اس نے ساز بند کیا—

چاروں اور کالی رات چھا گئی۔

سنگیت کا آخری سُر —

زمین کا شُدھ نکھاد—

جیسے تیز ہوائیں بکھر گئی ہیں

یہ ٹکڑے کس کے ہیں—؟

میری آنکھوں کے—؟ میری آواز کے—؟ میری یادوں کے—؟

اب کیسے کہانی کیسے لکھوں گی—؟

سارے رنگیں خواب— خوبصورت خیال— مہربان چہرے— پیار کے رشتے—

انہیں امید کے جس دھاگے میں باندھا تھا۔

کیا وہ ٹوٹ گیا—؟

میرا قلم اب خشک ہو گیا ہے۔

سفید کاغذ پر کوئی نیا حرف نہیں لکھ سکوں گی۔

کیا خالق اور تخلیق کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے—؟

ادھر اُدھر دیکھا—

بھڑکتی ہوئی چنگاریاں— دھاگے— رونے چلّانے کی آوازیں—

کدھر دیکھوں—؟ کہاں جاؤں—؟ کیسے ڈھونڈوں—؟

ٹھہرو—

چاروں طرف مت دیکھو—

کچھ پانے کی امید کہیں نہیں ہے۔

اُدھر دیکھو—

پاگل اور جانور کتنے خوش ہیں۔ انھیں کچھ کھونے اور پانے کا عذاب نہیں سہنا ہے۔

علم کی کھوج میں تو سارے دکھوں کی جڑ ہے—

چاروں طرف دیکھا—
سب چلے گئے—رنگین سپنے—سنگیت کے سات سُر—خوبصورت خیال—
جھلملاتی امیدیں—مہربان چہرے—تنہائی نہیں جاتی۔
کیا ٹوٹ گیا ہے—؟
میں بھی ہاتھ میں پتھر اٹھا لیتی ہوں—
مگر اب کسے ماروں—؟
کسی کے لئے راستے سے ہٹ جانے والا—
سچ بول کر سولی چڑھ جانے والا—
جھوٹ کی گھپ اندھیاری میں اپنے۔اپنے من سے سچ کے دیپ جلانے والا—
کوئی نظر نہیں آتا—
شاید یہ ان سب کے ٹوٹ کر بکھر جانے کی آواز تھی—؟

☆☆

بھاگو بھاگو

انتقام کے اندھیرے میں ساری گلیاں سارے شہر ایک ہو گئے تھے۔

مارو ——مارو —— بھاگو —— بھاگو

لوگوں کی آوازیں ہر طرف گونج رہی تھیں —— انتقام کے اندھیرے میں سارے گلیاں، سارے شہر ایک ہو گئے تھے —— آشا کہاں جاتی!

وہ اپنے دونوں بچوں کا ہاتھ تھامے چاروں طرف دیکھتی —— پناہ کہیں نہیں تھی — آج سے پہلے ننھے بچوں کے آگے سے ان کا مستقبل اس طرح کسی نے نہیں چھینا تھا — میرے بچوں پر حملہ کرنے والے آرہے ہیں —

مارو —— مارو —— بھاگو —— بھاگو ——

آشا وہ سب راستے جانتی تھی، جو دل کے یقین سے پھوٹتے ہیں —— وہ دیکھ رہی تھی کہ بے شمار سمتوں میں پھیلی ہوئی ان سڑکوں کے اَنت پر کہیں نہ کہیں روشنی کا پڑاؤ ہے۔ جب ہی تو سب چل رہے ہیں۔ دنیا کے تمام فلاسفر، آرٹسٹ، ادیب اور سائنٹسٹ — سب اسی راہ کی کھوج میں ہیں — وہ راہ جس میں بے شمار ظلم جنم لیتے ہیں، جنھیں ہم روا رکھتے ہیں۔ کیونکہ لاکھوں برسوں کی کھوج کے بعد آشا کے سائنٹسٹ شوہر سلطان نے، سمندروں کا جو امرت نچوڑا تھا — وہ کوئی راکشش پی گیا۔ اب ساری دنیا کے سمندروں میں بِس بھرا تھا مگر آشا کے آنے والے بچے، راہول اور چٹی جیسے اس بات کو نہیں مانتے تھے — وہ تو یہ حق مانگتے ہوئے آئے تھے کہ خوشی کا خوش ذائقہ پھل، دنیا کے تمام مذہبوں اور دستوروں کا وعدہ ہے — وہ پلٹ کر ان لوگوں کا حشر کیوں نہیں دیکھتے جو اس حق کو مانگنے والوں کا ہوا —؟ ماں بننے کے بعد آشا خطروں میں گھر گئی تھی حالانکہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود وہ کبھی تشکیک میں نہیں الجھی تھی۔ وہ تو کالج میں ہسٹری پڑھاتی تھی۔ پانچ

برس میں اس نے پانچ سو طالب علموں کو بھارت کی تاریخ پڑھائی تھی۔ یورپ کی تاریخ، یونان اور روما کی تاریخ — عربوں کی فتوحات اور روس کا انقلاب — اس نے تمام دنیا کے ادب کی بہترین کتابیں پڑھی تھیں اور ہر مذہب کے بنیادی عقیدے کو سمجھتی تھی۔

پھر بھی اسے شک تھا کہ لوگ اس کے بچوں کو مارنے آرہے ہیں — ہر طرف سے گھیراؤ کیے ہوئے ہیں —

مارو — مارو — بھاگو بھاگو — چاروں طرف سے یہ آوازیں گونجتی تھی۔ کالج میں فائرنگ ہوگئی — پانچ لڑکے مارے گئے۔ پانچ برس کی لڑکی کی جبری توہین — مرادآباد میں فرقہ وارانہ فسانہ — علی گڑھ میں قتل عام — دہلی میں بچوں کا اغوا —

اخبار آشا کے ہاتھ میں کانپنے لگتا — وہ کون سے راستے سے راہول کو اسکول بھیجے گی۔ چنّی کو کیسے محفوظ رکھے گی......؟

سارے راستے، ساری گلیاں، انتقام کے اندھیرے میں ایک ہوئے تھے پناہ کہیں نہیں تھی۔

مارو — بھاگو — ہر طرف یہی آوازیں گونجتی تھیں۔

سو جاؤ — ہر وقت ایسے بھیانک خواب دیکھنا چھوڑ دو — سلطان اسے راتوں میں تھپکیاں دیتا تھا — اس کا سائنٹسٹ شوہر جسے اس سال وگیان کا سب سے بڑا ایوارڈ ملا تھا — وہ خلا میں روشنی بھیج چکا تھا۔ مگر پہلے اپنے بچوں کے پیر تو زمین پر ٹکا دیتا —!

دشمن گھات میں تھا — ننھے ننھے بچے چھپتے پھر رہے تھے —

بچاؤ — بچاؤ — مگر انتقام کے اندھیرے میں سارے راستے، ساری گلیاں ایک ہوگئی تھیں —

آشا ہر رات تمام دروازے، کھڑکیاں بند کر کے سونے کی عادی تھی۔ پھر بھی سلطان کے بہکاوے میں آگئی — سلطان سائنٹسٹ تھا۔ اس لئے اسے دنیا سے بڑی آس لگی تھی — پھر جب راہول نے ان کے دروازے پر دستک دی تو سلطان خوشی کے مارے اچھل پڑا — لو، وہ آگیا جو نئے چاند، نئے سورج ڈھونڈ نکالے گا — وہ دنیا میں پھیلی ہوئی اس خود غرض اور بے رحمی کا علاج اپنے ساتھ لائے گا — میرا بیٹا — میرے آنے والے دن کا اجالا — اتنے اہم انسان کی تشکیل کتنا جان جوکھوں کام تھا۔

اب آشا کو ساری دنیا سنوارنے کی فکر ہوگئی — دھوپ تیز نہ ہو، بارش تھم جائے، کسی نئی لڑائی کی بنیاد نہ پڑے — کالونی میں کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو، وہ روز اخبار بڑے دھیان سے پڑھتی — خبریں بڑے غور سے سنتی —

مارو — مارو — بھاگو — بھاگو — سارے اخبار میں ایک ہی خبر پھیلی ہوئی تھی یہ آوازیں گونج رہی تھیں — قاتل ہر طرف دوستوں کا سوانگ بھرے گھوم رہے تھے — ساری گلیاں، سارے شہر انتقام کے اندھیرے میں ایک ہو گئے تھے —

سلطان کو آشا کے خوف پر ہنسی آتی تھی۔ وہ جب چھٹی مناتا تھا تو آشا اور بچوں کا ہاتھ تھامے بے فکری کے ساتھ گھومتا — آگرہ — کشمیر — دہلی — بنگلور — اس نے اپنے بچوں کو بھارت کا کونا کونا دکھایا — مگر بچے تو ان دونوں کو گھسیٹ کر ''زو'' لے جاتے تھے — انہیں زو بہت پسند تھا — سلطان اور آشا کو بھی جنگل کا پرسکون ماحول اچھا لگتا تھا۔ راہول اور چٹی مور کو چھوتے، ہرن کو اپنے ہاتھ سے پتے کھلاتے اور بن مانس کے لیے سگریٹ پھینکتے تھے۔

''ممی بندر کا بچہ شرارت کرے تو اس کی ممی مارتی کیوں نہیں —!''

چٹی اس کی ساری کا پلّو پکڑ کر پوچھنے لگی — پھر تو آشا کو بھی سوچنا پڑا کہ بندر کے بچے بڑے ہو کر بندر کیسے بن جاتے ہیں۔ انسان کے بچوں کو انسان بنانا تو بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ بندریا کتنے مزے میں ہے۔ اسے بچوں کو اسکول بھیجنا ہے نہ انسانیت کے سبق پڑھانا ہیں۔ وہ بے فکری کے ساتھ بندروں سے عشق بازی میں مصروف ہے یہ سوچے بغیر کہ اس کا عاشق ہندو ہے یا مسلمان —

ایک بار زو! میں آشا اور سلطان کے قریب ایک امریکن جوڑا شیروں کے فوٹو لے رہا تھا۔ شیر قریب آیا تو لڑکی ڈر کے مارے لڑکے سے لپٹ گئی۔

''او ڈارلنگ میں شیر کو اتنے پاس نہیں دیکھ سکتی۔''

''مگر شیر بڑا سمجھدار جانور ہے سوئیٹی۔'' لڑکے نے لڑکی کو سمجھایا۔

''جب تک اسے انسان سے خطرہ نہ ہو وہ کبھی حملہ نہیں کرتا۔''

''پاگل ہے یہ امریکن —'' آشا نے ہنس کر سلطان سے کہا۔ ''کتابوں سے فقرے رٹ کر آیا ہے۔ بھلا ان خوفناک درندوں پر کوئی اعتبار کر سکتا ہے۔''

پھر ایک دن بازاروں میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔

''اری پاگل بچوں کے ساتھ مسلمانوں کے محلّے میں کیوں گھوم رہی ہے گھر میں چھپ جا۔''

''کون سے گھر میں چھپ جاؤں! کس سے کہوں کہ میرے بچّے ہندو نہیں ہیں۔ان کا باپ مسلمان ہے مگر کالونی کے تو سب ہندو مسلمان ان دونوں سے ناراض تھے—برہمن کی لڑکی اور ایک ملیچھ مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی— منحوس سید زادہ ایک کافر عورت کو مسلمان کیے بغیر گھر میں ڈالے ہوئے ہے—ان دونوں کو تو سنگسار کرنا چاہیے—''

مارو—مارو— پکڑو—بھاگو—

(یوں لگتا اب خدا کی بادشاہت ختم ہو گئی—انسان کی تانا شاہی کا دَور آ گیا ہے۔)

آشا نے سلطان کو زندگی بھر کے لئے قبول کیا تھا تو صرف اپنے بارے میں سوچا تھا۔اپنے برہمن خاندان کی برہمی اور سلطان کے سید خاندان کی بدنامی کا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔اب تو اسے یقین تھا کہ راہول ہی وہ بچہ ہے جو نئی دنیا کی نیو رکھے گا۔کیونکہ وہ راہول ہے اس کے پُرکھوں نے تمام دنیا کے دکھوں کا کڑوا ذائقہ چکا تھا۔تاکہ وہ اصلی مٹھاس ڈھونڈیں لیکن انہوں نے اپنے اوپر ہر سکھ حرام کر کے نِروان پا لیا تھا۔اب بارہ یُگ کے بَن باس کے بعد اپنا کشکول راہول کو دے دیا ہے—راہول کسی کی جیو ہتیا نہیں کرے گا— کسی کھیت میں نفرت کے بیج نہیں بوئے گا— کوئی ناکامی اس کا راستہ اب نہیں روکے گی— مگر موت تو ہر گلی میں، ہر موڑ پر اس کی تاک میں تھی۔ انتقام کے اندھیرے میں سری گلیاں سارے راستے ایک ہو گئے تھے—

آشا بچوں کو لے کر بند کمرے میں بیٹھ گئی۔

کھولو— کواڑ توڑ دو— جلا دو—باہر لوگ چلّا رہے تھے۔اس کے دروازے پر پتھر اور لاٹھیاں برس رہی تھیں۔

''سو جاؤ—سو جاؤ آشا—تمہارے دروازے پر کوئی نہیں ہے۔'' سلطان اسے تھپکیاں دے کر سلا دیتا تھا—

مگر اتنی ہاہا کار مچی ہو تو کوئی ماں چین سے سو سکتی ہے۔سارے مارنے والے سڑکوں پر نکل آئے ہیں نا—انھوں نے آج اپنے چہروں سے نقلی نقابیں نوچ پھینکیں ہیں۔اب وہ نہتے بوڑھوں، بے قصور نوجوانوں اور ہنستے کھلکھلاتے بچوں کو روندتے پھر رہے تھے—سارے خالی

ہاتھ انسان گھروں میں بند تھے کہ قتل ہونا آج ان کے نصیب میں لکھا تھا۔

آشا کے چاروں اور رات پھیلی ہوئی تھی۔ ننھے بچوں کی ماں والی رات جب آکاش پر ہر طرف تارے جھلملاتے ہیں—چاند کے لئے مچلنے والے بچے کی خاطر، چاند سچ مچ ماں کی گود میں اتر آتا ہے اور نیند کی پریاں جھولا جھلانے ننھے کو چاروں اور سے گھیر لیتی ہیں—راہول اس کے ہاتھ پر سر رکھے لیٹا ہے—چنی اس کے پیٹ پر سو رہی ہے۔ چنی کے سنہرے بال آشا کے چہرے پر پھیل گئے ہیں۔ چنی کا ننھا سا ہاتھ اس کی گردن میں لپٹا ہوا ہے—

''ممی مجھے ڈر لگ رہا ہے— کہیں غنڈے ہماری کالونی میں نہ آ جائیں—''

ایسی بری بات مت سوچو، میری جان—تم راہول ہو— کیا ڈر جاؤ گے! راہول کو سلا کر وہ سوچتی ہم یہ کالی کیسے راتیں کاٹیں گے—اجالے تک کیسے پہنچیں گے—؟

ایک دن آشا نے کہا—''ہم اپنے بچوں کو لے کر اسٹیٹس چلے جائیں گے۔ تمہیں وہاں بہت اچھی جاب مل سکتی ہے۔''

''ہاں لیکن میں نے جو پروجیکٹ شروع کر رکھے ہیں وہ ادھورے رہ جائیں گے اور پھر وہاں کالے بچوں کی توہین کی جاتی ہے۔ میرے بچے نفرت کا یہ عذاب کیوں سہیں—'' وہ انتظار کرنے لگی کہ سلطان کے پروجیکٹ پورے ہوں تو کیا انقلاب آئے گا دنیا میں—؟

یہ سلطان کیسا بے حس ہے۔ دن رات خلاؤں کی کھوج میں اوپر تکے جاتا ہے۔ اس کے لئے چاروں اور پھیلی ہوئی کائنات بڑی اہم ہے۔ مگر آشا ماں تھی، اس کی جڑیں دھرتی میں پھیلی ہوئی تھیں، جہاں سے آشا کا بیج پودا بن کر پھوٹتا ہے۔ جہاں سے سورج زمین کا سینہ چیر کے اگتا ہے—سلطان کتنا مطمئن تھا— کتنے اعتماد کے ساتھ وہ آنے والے سو برسوں کی ریسرچ کا پروجیکٹ تیار کر رہا تھا، جب کہ آشا کے لئے ہر آنے والی صبح ایک دھوکا تھی۔ پھر اس نے طے کر لیا وہ بھی اب کسی سے نہیں ڈرے گی۔

بھاگ جاؤ— تم مجھے نہیں مار سکتے—میں آشا ہوں—میں نے ساری دنیا کے تاریخ پڑھی ہے۔ تم تاریخ کے ہر ورق پر راون بن کر لکھے گئے ہو۔ یزید بن کر پڑھے گئے ہو۔ ہم ہر سال تمہارا شریر جلاتے ہیں۔ تم پر لعنت بھیجتے ہیں اور تم پھر اپنا خونخوار چہرہ لئے آ جاتے ہو...... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ہوم منسٹر سے ملوں گی—میں کوئی معمولی عورت نہیں ہوں—سلطان کی

بیوی ہوں — میں مخالف فرقہ داری کنونشن کی سیکریٹری ہوں۔ تم جیسے غنڈوں کا کیا علاج ہونا چاہیے اس پر اب تک چار سیمینار کر چکی ہوں —

مگر آشا کی پکار کون سنتا — چاروں طرف آگ بھڑک اٹھی۔

مارو — مارو — بھاگو — بھاگو — جلا دو —

ہیلو — ہیلو — غنڈون نے ہمارے مکان کو گھیر لیا ہے — میں مسز سلطان ہوں۔''

اس نے ہوم منسٹر کو فون کیا — ''میں وہاں آجاؤں بچوں کو لے کر — ہاں — راستے تو بہت خطرناک ہیں۔''

''ہیلو — ہیلو — ذرا سلطان کو خبر کر دیجیے — ہیلو ہیلو — ''مارو — مارو (آشا کی آواز چیخ و پکار میں دب گئی۔)

سلطان زمین پر نہیں تھا — وہ تو بس خلا میں جیتا تھا۔ اس کے ایوارڈز اور سیمینار اس کا پروجیکٹ اور فرقہ واریت کے خلاف لکھے ہوئے آشا کے پیپر سب گھر کے آنگن میں جل رہے تھے — فضاؤں میں بکھر چکے تھے — آشا بچوں کو پلو میں چھپائے بھاگ رہی تھی — گلی کے نکڑ پر کشورناتھ کی دوکان تھی جہاں ساری کالونی کے ہندو غنڈوں کا اڈہ تھا — دکانوں کے پیچھے مسجد تھی، جس میں مسلمانوں نے لاٹھیاں اور برچھیاں چھپا کر رکھی تھیں۔

پناہ کہیں نہیں تھی — وار کرنے والے اسے ہر طرف سے گھیر چکے تھے۔

آج — ساری گلیاں، سارے راستے انتقام کے اندھیرے میں ایک ہو گئے — کربلا والی رات آج پھر دنیا میں اتر آئی تھی۔

کہیں چھپ جا — لوگ اسے صلاح دے رہے تھے۔

بھاگو — بھاگو — وہ بھاگتی رہی — یہ تو جنگل تھا، نہیں ''زو'' تھا — سامنے خوفناک شیر منہ پھاڑے کھڑے تھے —

(جب تک انھیں انسان سے خطرہ نہ ہو شیر حملہ نہیں کرتا۔) ایک امریکن لڑکا کہہ رہا تھا۔

اور آشا جلدی سے بچوں کا ہاتھ تھامے شیر کے پنجرے میں گھس گئی —

اب وہ مطمئن تھی کہ درندوں کے چنگل سے نکل گئی تھی —

☆☆

آپ کا سواگت ہے منتری جی—

نمسکار منتری جی— آپ کا اس گاؤں میں سواگت ہے۔
آؤ— آؤ— پانچ برس بعد آپ کی صورت دیکھی ہے میں نے منتری جی آپ تو مجھ بڑھیا کو بھول چکے ہوں گے۔
آپ آج ہم سے ووٹ لے کر کل ہمیں کچھ دینے کا وعدہ کرنے آئے ہیں نا—؟
ارے— مجھ اندھی لنگڑی بڑھیا سے کوئی وعدہ مت کرو منتری جی—
خدا— بھگوان، اوتار اور آپ جیسے لیڈر لوگ— سب ہم سے کل کا وعدہ کرتے ہیں۔
آج ہمیں کسی نے کچھ نہیں دیا— آج ہمارے لئے کوئی کچھ نہیں لاتا—
مجھے یاد ہے منتری جی— آپ کے دادا جب ہمارے گاؤں میں ووٹ لینے آئے تھے تو انہوں نے، گاؤں میں پانی لانے کا وعدہ کیا تھا— بجلی کی روشنی لانے کا—
ٹریکٹر چلانے کا— پھر آپ کے پتا جی نے بھی یہی وعدہ کیا تھا—
اور آپ بھی ہم سے یہی وعدہ کر رہے ہیں—!
بھگوان آپ کو سلامت رکھے— آپ کے بیٹے بھی ہمارے گاؤں میں ووٹ لینے آئیں—
دے دو بیٹا— دے دو— سب ووٹ منتری جی کو دے دو—
اِدھر اُدھر مت دیکھو منتری جی—
ہمارے پاس اوڑھنے کو آسمان بچھانے کو زمین ہے۔
ہمارے بچوں کو پیاس لگتی ہے تو ایک دوسرے کا خون پی لیتے ہیں۔
بھوک لگے تو جوان عورتوں کو پکڑ کے ان کا گوشت چبانے لگتے ہیں—

بیٹا— جلدی سے سب ووٹ اٹھا کر منتری جی کو دے دو—

ارے چھوکرو— آؤ آؤ— منتری جی کا سواگت کرو—

پہلے جلدی سے مندر جانے کا راستہ تو صاف کر دو۔

منتری جی کٹی کٹی ہوئی لاشوں اور بہتے ہوئے خون پر پاؤں رکھ کر بھگوان کے درشن کرنے اندر کیسے جائیں گے—؟

ہاں— بہت بدبو آ رہی ہے— آپ مت گھبرایئے منتری جی—

یہ گئو ماتا کا گوشت نہیں ہے— یہ تو عورتوں کو چیر پھاڑ کے پھینک گئے ہیں وہ—

ارے— کوئی مجھ بڑھیا کی بات سنو— اپنے سب ووٹ منتری جی کو دے دو بیٹا—

مگر ایک بات سنو منتری جی— مندر کے اندر مت جاؤ—

آپ کے آنے کی خبر سن کر بھگوان مندر سے چلے گئے ہیں۔

☆☆

پردہ گرتا ہے

پردہ اٹھتا ہے۔

سارے اسٹیج پر اندھیرا ہے۔ ہال میں تماشائی بیٹھے ہیں۔ بہت اہم ادیب، اسٹیج اور فلم کے ایکٹر — ہزار اور پانچ سو کے ٹکٹ خرید کر آنے والے معزز مہمان —

وہ سب گھپ اندھیاری سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب کوئی ڈرامہ شروع ہونے والا ہو تو کیسا سناٹا سا چھا جاتا ہے —؟

جیسے اسٹیج نہ ہو دنیا کا منچ ہو جس پر ایک عورت کی کہانی شروع ہو رہی ہے —

عورت کی کہانی ہمیشہ مزیدار ہوتی ہے۔

اس کہانی کو سنانے والا داستان گو سناتے سناتے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں — لیکن جب وہ اسٹیج کی ہلکی ہلکی روشنیوں کے بیچ آکر کہتا ہے۔

ایک عورت تھی —

یہ سنتے ہی سب کی نگاہیں، کان اس طرف گھوم جاتی ہیں۔

پھر کیا ہوا —؟

عورت کے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔

اور جب اسٹیج پر اندھیرا ہو تو دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ کیونکہ عورت کو اندھیروں میں ڈوب لینے کے بعد ہی تو تو کہانی جنم لیتی ہے —!

اندھیرا ہی تو کائنات کی ہر تخلیق کا ہم راز ہے —

پھر اندھیرے اجالے کی ڈوبتی ابھرتی پرچھائیوں میں سے رنگین کپڑے اور چمکدار ٹوپیاں اوڑھے دو جوکر نظر آئے۔ ہاتھوں میں ڈفلیاں بجاتے۔ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے، اچھلتے کودتے

اور اپنی چھچھوری حرکتوں سے تماشائیوں کو ننھے بچوں کے طرح ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔

پھر انھوں نے تماشائیوں سے معذرت کی کہ وہ ایک عورت کی کہانی سنانے آئے تھے۔

مگر وہ ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اب کیا کریں——؟

دونوں مسخروں نے بڑی دیر کی بحث تکرار کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ ایک عورت کو تخلیق کریں گے——

وہ جلدی جلدی طرح طرح کے رنگ لاتے——میدہ——گی——شکر——بہت سی خوشبو اکٹھی کی——وہ تھوڑا سا فولا دلائے——اور سلگتے ہوئے انگارے——

پھر انھیں خیال آیا مرچ ڈالنا ضروری ہے۔اس کے بغیر عورت چٹخارے دار نہیں بنے گی——بارہ مصالے والا چاٹ کا مسالہ بھی گھول دیا اور ایک شہد کی بوتل انڈیل دی۔

سب چیزوں کو گوندھنے کے بعد انھوں نے ایک چھوٹی سی گڑیا بنائی اور اسے ایک اونچے استھان پر بٹھا کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگے——

جوکر کے اس کام سے بور ہو کر تماشائی بھی اونگھنے لگے تھے۔

اچانک بہار کے جھومتے ناچتے سُروں نے سارے اسٹیج پر رنگ و نور کا اجالا سا پھیلا دیا——رنگین جلتی بجھتی روشنیاں اور پھر تیز روشنی کے دائروں میں ......وہ چھوٹی سی گڑیا ......ناچنے لگی۔جھوم رہی تھی——تیزی سے گھومتے گھومتے اس کا قد اونچا ہونے لگا——اور پھر بار بار جلتے بجھتے چراغوں کے دائروں میں کچھ سائے لڑکی کے آس پاس گھومنے لگے——

وہ بار بار ہاتھ بڑھا کر تالیاں بجا کر، لڑکی کو چھونے کی کوشش کرتے—— مگر تیزی سے گھومنے ناچنے والی لڑکی جیسے کسی کے ہاتھ نہ آنے کی بات کر چکی تھی——

جو بھی اسے پکڑ لیتا——وہ کسی نہ کسی طرح اس گرفت سے نکل بھاگتی تھی——

اس کے چاروں طرف پڑا سرا ہیولوں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔

بہار کے تیز سُر دھیمے دھیمے ہو کر بھیرویں کے سُروں میں گھل گئے اور چاروں اور اجیارا چمکنے لگا——

روشنی کے دائرے میں......وہ لڑکی ناچتے ناچتے کس کی کھوج میں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

اسٹیج کے پیچھے کوئی عورت دھیمے سروں میں راگ بھیرو گنگنا رہی تھی۔

موہے بھول گئے سانوریا— آدت کہہ گئے اجھوں نہ آئے۔ لینن نہ کوئی خبریا—

پھر اچانک بہار کے سُر گونج اٹھے— یہ سر ان رنگین روشنی کے دائرے سے گھوم رہے تھے۔

لڑکی نے پھول پھینک دیا— گھومتے ہوئے دائروں میں گھر کے وہ بھی گھومنے لگی۔

اس کے آس پاس ناچنے والے جوکر تھم گئے اور خوشی سے چلانے لگے کیونکہ ایک بڑا سا رنگین پھول لڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر کنول کے اس کٹھورے جیسے پھول کے بیچ میں سے ایک لڑکا نکلا— وہ جیسے کسی نشے میں مدہوش تھا—

لڑکے نے ناچتے ناچتے تھم کر اسے دیکھا اور جیسے وہ بھی اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی— ناچتے ہوئے آگے بڑھ کر اس نے لڑکے کو تھام لیا—

اب ان دونوں کے ساتھ جوکر بھی ناچ رہے تھے۔ بہار کے سُر دُرت پر پہنچ گئے— کھتک کے توڑے— جھٹکے— ٹھمکیاں— ان میں ناز وادا بھی تھا—

دور ہٹنے کا خوف— پھر ملن کے سرشار لمحوں میں ہم آغوشی کی خواہش— پاس آنے اور دور چلے جانے کا انداز— دُرت ہر ایک دوسرے میں سما جانے کی بے تابی۔

ہال میں بیٹھے تماشائی زور زور سے تالیاں بجانے لگے—

پاس آنے اور روٹھ جانے کی اداؤں کے ساتھ وہ دونوں ایک فرضی رتھ پر سوار ہو کر آکاش کی سیر کر رہے تھے—

پھولوں کے بیچ پر سو رہے تھے۔ ایک دوسرے سے ہم آغوشی کا کھیل۔ مدھر ملن کے گیتوں میں مدہوش ہو رہے تھے——

پھر جیسے لڑکا اس کھیل سے تھک گیا۔ وہ ناچتی ہوئی لڑکی کی باہوں کے حلقے کو ہٹا کر دھیرے دھیرے دور سرکنے لگا۔ لڑکی بھی دھیرے دھیرے اسے پکڑنے آگے بڑھتی گئی—

اور پھر اسٹیج پر بڑھتے ہوئے اندھیرے نے اسے گھیر لیا—

اب اسٹیج پر پھر اجالا بڑھنے لگا— دونوں جوکر سر کھجاتے، حیران پریشان ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنے لگے۔ اشاروں میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ وہ لڑکا کہاں چلا گیا—؟

کیونکہ اب وہ اکیلی لڑکی گھبراتی ہوئی ناچتے ناچتے ادھر اُدھر کچھ ڈھونڈ رہی تھی——

کون گلی گئیو شام بتادے کوئی——

گوکل ڈھنڈوں متھرا ڈھونڈوں

کوئی بولو میں کت جاوں——؟

کوئی بولو——؟

کون بولتا——؟ جوکروں کے ساتھ تماشائی بھی لڑکے کے چلے جانے سے بور ہو رہے تھے نسدن.......... ہمارے——جب سے شیام سدھارے——

پھر وہی اکتارے کے اداس سُر ——پھر وہی .... میرا۔ دونوں جوکر بھی گھبرا کے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ انھوں نے لڑکے کو کیوں جانے دیا——

ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں سے بھی انھوں نے لڑکے کے چلے جانے پر اس دلچسپ تماشے کے ختم ہو جانے کا افسوس کیا۔ اور پھر اپنی چھچوری حرکتوں سے سب کو ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔

کبھی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ کر گرا دیا——پھر لڑنے سے پہلے اپنے کپڑے اتارنا شروع کر دیے۔ ایک کے نیچے ایک اور——اتنے کپڑے تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے——

انھوں نے پھر ایک بار تماشائیوں کے آگے انھوں نے ہار مان لی——

اچانک ان کی نظر اسٹیج کے ایک اندھیرے کونے پر گئی——

وہ بال کھولے، اکتارہ ایک طرف ڈالے۔ بہت اداس پیٹ تھامے ہلکے ہلکے درد سے رو رہی تھی۔

دونوں جوکر گھبرا گئے——انھوں نے درد سے کراہتی ہوئی لڑکی کو پاس جا کر دیکھا اور کچھ سمجھ کر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگے——

پھر وہ تماشائیوں کے سامنے آئے اور اشاروں سے سمجھایا کہ وہ سب چپ رہیں——کیونکہ ایک بچہ آنے والا ہے۔ انھوں نے اشاروں میں جھوٹ موٹ جیسے ایک پردہ تان لیا اور اسٹیج پر دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھنے لگا تو گھپ اندھیاری میں کہیں ایک ننھا سا دیا روشن ہوا——

اور پھر روشنی کے اس دائرے میں وہ لڑکی ایک ننھے سے گڈے کو گود میں لئے

بیٹھی تھی ——

دونوں جوکر ادھر اُدھر گھبرا کے کچھ ڈھونڈ رہے تھے —— ان کی نظر لڑکی پر پڑی اور وہ تالیاں بجا کر خوشی کے مارے ناچنے لگے —— انھوں نے کبھی پاس آکر کبھی دور جا کر ننھے کی بلائیں لیں اور پھر لڑکی کو اپنے ساتھ ناچنے پر مجبور کر دیا۔

اب وہ تینوں بچے کے آس پاس ناچ رہے تھے۔ خوشی سے جھوم رہے تھے۔

تالیاں بجا کر لوریاں سنا کر بچے کو بہلا رہے تھے۔ انھوں نے ہاتھ کے اشاروں سے ایک جھولا بنایا اور اس میں بچے کو لٹا کے جھولا جھلانے لگے ——

اب ماں کے لئے بڑے کٹھنائیاں تھیں —— وہ کبھی بچے کو گود میں لے کر لوری گاتی —— کبھی دودھ پلاتی —— اسے بہلا پھسلا کے کھانا کھلاتی —— اور اسے گود میں لے کر بچے کے باپ کی راہ تکنے جاتی ——

کون گلی گیو شیام بتادے کوئی ——

ماں کا بیٹا بڑا ہو رہا تھا —— اس کی شرارتوں سے پریشان ماں چاروں طرف اسے پکڑنے کو دوڑتی پھر رہی تھی —— دونوں جوکر بھی اسے پکڑنا چاہتے تھے تو وہ ہاتھ نہ آتا ——

ایک ...... گھوڑے پر سوار وہ سارے اسٹیج پر گھوم رہا تھا —— اتنا اونچا —— ماں اسے پکڑنے چھونے کی کوشش کر کے تھک گئی ——

اس کے سامنے کتاب رکھ کر بیٹھ جاتی —— وہ اسکول چلا جاتا تو اس کے لوٹ آنے کی راہ دیکھتی تھی ——

دونوں جوکر ماں کی پریشانی دیکھ کر اسٹیج کے بیچ میں آئے اور اشاروں میں تماشائیوں کو بتانے لگے کہ وہ ماں بن کر ناچنا گانا سب بھول گئی ہے —— اب وہ

صرف ایک ماں بن گئی ہے —— ہم اب کیا کریں ——؟

وہ پھر اپنی چھچھوری کوششوں سے تماشائیوں کو ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔

ماں بیٹے کی انگلی پکڑ کر چلنے لگی —— پھر بیٹا دوڑنے لگا۔ ماں اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے میں تھک گئی۔ وہ شرارت سے چیزیں توڑنے لگا ——

بیٹے کا قد دھیرے دھیرے بڑھنے لگا۔ ماں اس کے سر تک ہاتھ نہیں لے جاسکتی ——

پھر بیٹا ماں کے ساتھ گھومتے گھومتے اسے ایک جگہ بٹھا کر اس کا سر جھکا دیتا ہے۔اس کا منہ بند کر دیتا ہے۔اور ایک جوکر بڑی شرمندگی کے ساتھ تماشائیوں کے ساتھ کہتا ہے۔

پتھر کو بھگوان کے روپ میں ڈھالنے کے لئے دل کا سارا پیار رینا پڑتا ہے۔مگر عورت کو پتھر بنانا ہو تو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اسے صرف ماں کے روپ میں ڈھال دو۔

کیونکہ عورت نہ بھگوان بن سکتی ہے اور نہ خدا— نہ رام بنے گی نہ رادن

یہ سب تو مرد کے روپ ہیں— عورت کا صرف ایک ہی روپ ہے—ماں—

اس لئے ستار کی ہلکی دھن میں ایک ہی آواز آتی ہے—ماں—ماں—ماں—

اب اسٹیج پر دھیرے دھیرے ہلکی روشنی میں ماں چاروں طرف بے بسی سے دیکھ کر گھوم رہی ہے۔

جس طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔چنچل لڑکے لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کرتے ناچ رہے ہیں۔مگر ماں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے تو دور ہٹ جاتے ہیں۔

ماں کے آس پاس اندھیرا بڑھتا جاتا ہے—دونوں ہاتھ پھیلائے گھبراتی ہوئی ماں کبھی ادھر بڑھتی ہے کبھی اُدھر—پھر وہ تماشائیوں کی طرف دیکھ کر پوچھتی ہے—

دونوں کنارے مجھ سے دور ہیں—ادھر جاؤں یا ادھر——؟

دھیرے دھیرے اندھیرا ماں کی طرف بڑھتا جاتا ہے اور دھیرے دھیرے اسٹیج کا پردہ بھی گرنے لگتا ہے—

☆☆

ایک خلاباز کی رپورٹ

کائنات کے آس پاس
ایک سائنٹسٹ نئے سیاروں کی کھوج میں گھومتا رہا۔
کولمبیا میں سفر کر کے وہ واپس آیا۔
ایک نیا انکشاف کر کے تہلکہ مچا دیا۔
'وہ جو سورج سے دور، ایک ننھا سا ستارہ چمک رہا ہے—؟

وہ دنیا ہے۔
وہاں زندگی ہے— انسان ہیں۔
انہوں نے زمین پر بیج ڈالے ہیں— پھول کھلائے ہیں۔
کنوئیں کھودے ہیں۔
مسجد، مندر بنائے ہیں۔
وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ناچ رہے ہیں—!''

اس خبر سے ساری کائنات میں دھوم مچ گئی۔
بہت سے سائنٹسٹ کولمبیا میں بیٹھ کر اس نئے سیارے کی کھوج میں نکل پڑے۔
چلو— ہم بھی اس دنیا کی سیر کر لیں۔
دنیا میں پہنچ کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔
ہر طرف آگ، دھواں— ایٹمی ہتھیاروں کے شعلے ٹوٹی ہوئی مسجدیں— جلتے ہوئے
میوزیم دنیا میں اب زندگی کے آثار نہیں رہے۔
واپس آ کر سائنٹسٹ نے اپنے آفس کو رپورٹ دی۔
ہر طرف حرص و ہوس کا دھواں پھیلا ہوا ہے۔
معلوم ہوتا ہے ہم سے پہلے وہاں بُش پہنچ گیا تھا—؟

☆☆

زو میں

آؤ آؤ——

سب بچو——!ادھر آؤ——
دیکھو یہ زو کا سب سے خطرناک جانور ہے۔

اس سے دور رہے۔
یہ اچانک وار کر کے انسان کا خون پی لیتا ہے۔
اندھیرے میں بے خبر انسانوں پر وار کرتا ہے۔
اس کے پاس مت جاؤ۔
اس کی میٹھی بولی دور سے سنو۔
دور کھڑے ہو کر اس کے کرتب دیکھو۔
وہ منہ پھاڑ کے چلاّ تا ہے۔
جیسے پوچھ رہا ہو——تم میرے لئے کیا لائے ہو——؟
ڈر کے مارے بچے اس کی طرف پھینک دیتے ہیں۔
پھل——مٹھائی——بسکٹ——چاکلیٹ

وہ زور زور سے چلاّ تا ہے۔

بچوں کو ڈراتا ہے۔

اور لاؤ——اور لاؤ——

ورنہ تم سب کو کھالوں گا۔

زو کے سب جانور اس سے ڈر کے چھپ جاتے ہیں۔
لوگ اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑ کے دور ہٹ جاتے ہیں۔
تماشہ دیکھنے والا ایک بچہ اپنے باپ کے پیچھے چھپ کر پوچھتا ہے۔
"ڈیڈی——وہ جنگل کی کون سی پارٹی کا لیڈر ہے——؟

☆☆

اکیلا سمندر

میں اکیلا ہوں۔
اکیلا، شانت اور گمبھیر
مجھے کوئی نہیں پکارتا۔
میری سوچ کا کرب
دل کا طوفان
دل ہی میں اٹھ کر رہ جاتا ہے۔
مجھ سے کوئی نہیں ڈرتا۔
وہ جانتے ہیں۔
میں اپنی حد سے آگے نہیں بڑھوں گا۔
ان پر جھاگ اڑا کر رہ جاؤں گا۔
میں پیاسی ریت سے لپٹ کر سوتا ہوں۔
اسے سیراب کر کے پلٹ جاتا ہوں۔
ازل سے ابد تک پھیلا ہوا۔
فنا اور بقا کے راز کا محرم
انہوں نے اپنے گناہوں کے نشان
میرے اندر چھپا دیئے ہیں۔
دنیا بھر کے غارت گر
حرص و ہوس کے شیدائی

میرے اوپر سے گزرے ہیں۔
ہیرے موتی رولنے والے۔
دل کی مرادیں پانے والے۔
جھولی بھر کے کہتے ہیں۔
اس کے دل کی گہرائیوں کو مت چھونا
نیچے جوالا مکھی بھڑک رہی ہے۔

☆☆

کاش

دوڑتے ہوئے ان برسوں کے ساتھ۔
میری جوانی بیت جاتی۔
رشتے ناطے ٹوٹ جاتے۔
ہر دروازے پر دستک دیتا۔
اندر سے آواز آتی۔
"کون ہو تم ——؟"
میں آگے بڑھ جاتا۔
چور، اچکے ڈاکو
میری ہر چیز اٹھا کر لے جاتے۔
خالی دل، خالی ہاتھ
میں بستی بستی گھومتا پھرتا——
اَن جانے راستوں پر
جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔
کبھی کبھی ایسا لگتا۔
یہ کوئی راستہ ہی نہ تھا۔
بھاگتے لوگوں، دوڑتی کاروں کے بیچ
میرے پھیلے ہاتھوں پر
وہ ایک روپیہ پھینک کر ہنستی
وہ ہنستی تو میرے پاس ہوتی ——!

☆☆

او کالے برقعے والی لڑکی ــــ

او کالے برقعے والی لڑکی!

کالے حصار میں قید رہو۔

کالی نقاب میں منہ چھپالو۔

اوپر مت دیکھو ــــــ

اس کالی رات کا انت کہیں نہیں ہے۔

مگر اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔

ان آنکھوں سے صرف ''بہشتی زیور'' پڑھنا ہے تمہیں۔

وفا، ایثار اور صبر کے سب سبق یاد رکھنا ہیں تمہیں۔

اگر ''وہ'' بے چارے تم پر پہلی نظر ڈال کر

اپنی نگاہ نہیں جھکا سکے۔

تو انہیں دوسری نگاہ ڈالنے کے عذاب سے بچاؤ۔

اپنے چہرے پر کالی نقاب ڈال لو۔

تمہارا چہرہ شاعروں، فن کاروں کا موضوع سخن ہے۔

تم نہیں ہو ــــ

''نہ ــــ''

اس کتاب کی طرف ہاتھ مت بڑھانا۔

علم ــــ ادب ــــ سائنس اور سیاست ــــ؟

اگر تم نے یہ کتاب کھولی تو ــــ

ایک ڈرامہ شروع ہو جائے گا۔

اور پھر یہ ڈرامہ دکھلائے گا کیا سین ——؟

''پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ''

اس لیے ——

گردن جھکا کر زمرد کا گلو بند دیکھو ——

یہ تمہاری وفا، ایثار اور رضا کا انعام ہے۔
کبھی کالی نقاب کو اٹھانے کی جرأت مت کرنا۔

ورنہ ——!

''اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ جائے گا۔''

او کالے برقعے والی لڑکی ——!

☆☆

اکیلا

آج پھر ہوم کا دروازہ میرے لئے بھگوان کے کواڑوں کی طرح کھلا۔

جب باباجی کی کار ہوم کے دروازے پر رکی تو میں خوشی کے مارے رو پڑی۔ ملیشم نے میرے آنسوں سے بھیگے چہرے کو دیکھا تو کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولے۔ ''اتنی بے صبر بنوگی تو باباجی بچے کے دام بڑھاتے جائیں گے''—

میں نے چونک کر ملیشم کی طرف دیکھا، اور مجھے بالکل یاد نہ آیا کہ وہ میرا پتی ہے، میں نے جانے کب اس کے ساتھ پھیرے لئے تھے جانے کیوں اس کی ہوگئی— میں— میں آج جانے کہاں تھی، جیسے پانچ برس کے لمبے خواب سے ابھی چونکی ہوں۔ ذرا دیر پہلے ہی تو میں سوئی تھی۔ اپنے بچے کو تھپک تھپک کر سلانے میں۔ بچہ کلیجے سے لگا ہو تو ماں کو کیسی گہری نیند آتی ہے۔

مگر باباجی کے ڈنڈے کی آواز سے میں جاگ پڑی۔

انہوں نے کمرے کے دروازے پر اپنا ڈنڈا مارا تو اندر ایک ساتھ بہت سے بچے خوشی سے چلاّ پڑے۔

باباجی آگئے— باباجی آگئے— آیا جلدی دروازہ کھولو۔ باباجی آئے ہیں— آیا نے دروازہ کھولا تو چار پانچ برس کے بیس پچیس بچے باہر نکل آئے۔ مرغی کے چوزوں کی طرح کلبلاتے چیختے چلاتے اِدھر اُدھر اچھلنے کودنے لگے خوشی کے مارے وہ سارے کمرے میں بھاگ رہے تھے۔ ہماری موجودگی کا انہیں ذرا بھی احساس نہ تھا۔ وہ باباجی کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ کر اپنی ننھی منی شکایتیں اور فرمائشیں کر رہے تھے۔ لیکن میری بے تاب نظریں صرف اسی کو ڈھونڈ رہی تھیں— شاید یہ ہے— نہیں— وہ— ہاں ہاں اس کی آنکھیں بالکل اجل جیسی ہیں۔

باباجی نے مجھے یوں بچوں کو گھورتے دیکھا تو بڑے طنز کے ساتھ بولے۔

''پسند کر لیجئے مسز ملیشم — سوچ لیجئے آپ کو کون سا بچہ لینا پسند ہے۔ اس سیکشن میں تین سے پانچ سال تک کے بچے ہیں۔''

بابا جی نے ہر بار میرے اوپر کتنا احسان کیا تھا۔ میرا بس چلتا تو آج ان کے پاؤں پکڑ لیتی۔

ملیشم کہتا تھا ہمیں بالکل چھوٹا سا بچہ لینا چاہیے تا کہ دنیا سے کہہ سکیں کہ یہ بچہ ہمارا ہے۔ مگر میں نہ مانی۔ اس طرح اپنے بچے کو گھر کیسے لاتی؟ میں نے اتنے چھوٹے بچے کو پالنے کی مصیبت سمجھائی۔ گھنٹوں اوندھے سیدھے سبق پڑھائے، تب کہیں ملیشم آج آنے پر راضی ہوا تھا۔ بچارے مرد — شادی کے بعد کتنی آسانی سے اپنی عقل کی باگ ہمارے ہاتھ میں دیدیتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو ملیشم کی ساری خوشیوں، اس کی پسند اور ناپسند پر بھی قبضہ کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ تو کسی طرح راضی نہ تھا ہوم کا بچہ پالنے پر —

''ان بچوں کے بارے میں آپ یہ بتا سکیں گے کہ کون سا بچہ ہندو ماں باپ کا ہے، کون سا مسلم ہے —؟ ملیشم نے سگار سلگاتے ہوئے بابا جی سے پوچھا۔

''ہاہا — ہاہا — بابا جی میری طرف دیکھ کر بڑی زور سے ہنسے۔

''اگر یہ بات واضح ہوتی تو مسٹر ملیشم تو یہ بچے ہمارے ہوم میں نہ آتے۔ کسی ہندو یا مسلم یتیم خانے میں بھیجے جاتے۔ یہاں تو صرف وہ بچے ہیں جو گھورے کا پھول ہیں۔ موری کے کیڑے ہیں، ہندو اور مسلمانوں کے منہ پر پھیکا ہوا تھوک ہیں اب اس سے زیادہ اور کیا بتاؤں — مسز ملیشم آپ ہی میری کچھ مدد کیجئے نا —''

بابا جی نے میری طرف دیکھا تو میں کانپ گئی۔

''نہیں نہیں ہمیں اپنا بچہ لینا ہوگا'' — میں ملیشم سے لپٹ گئی۔

کہیں بابا جی کی خوفناک باتیں سن کر وہ اپنا ارادہ نہ بدل دیں۔ پورے ایک سال کی کوشش کے بعد میں ملیشم کو راضی کر پائی تھی کہ بابا جی کے ہوم سے ہم ایک بچہ لائیں گے۔

جب سے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ میں اولاد پیدا نہیں کر سکتی۔ ملیشم بالکل پتھر بن گیا تھا۔ کہتا تھا بچے نہ ہوں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اچھا ہے، ہم اپنی جائیداد سے خود عیش کریں گے۔ حالانکہ دل ہی دل میں وہ بھی اولاد کے لئے ترس رہا تھا۔ جب ہی کوئی چھوٹا بچہ دیکھتا تو جھٹ

اٹھا کر سینے سے لگا لیتا تھا۔ کھلونے خریدنے کا اسے بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں الماریاں بھرلی تھیں کھلونوں سے۔ کہتا تھا مجھے اچھے لگتے ہیں کھلونے۔ ہر نئے ملنے والے سے پہلا سوال یہی کرتا تھا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟ اور پھر بڑی مسرت سے انھیں اطلاع دیتا کہ ہم اس جھنجھٹ سے پاک ہیں۔''

مگر میں کیسے صبر کرتی — ؟ میں — جو دو دن تک اپنے بچے کو خود دودھ پلا چکی تھی۔ میں نے تین بار اس کے پیشاب کے ڈائپر بدلے تھے اور تیسرے دن جب ڈاکٹر نے دودھ خشک کرنے کے لئے دوا لگائی تھی تو میرا کلیجہ جلنے لگا تھا۔ سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔

پھر ماں آئی اور بچے کے منہ پر کپڑا ڈال کر بولی۔

''جلدی اب یہاں سے چلو، تیرے ماما آنے والے ہیں، تجھے گھر میں نہ دیکھ کر شک کریں گے۔''

''ابھی ٹھہرو ماں۔ میں اسے یہاں چھوڑ کر ابھی نہیں جاؤں گی۔''

میں نے بچے کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا تھا۔ وہ بالکل اجمل تھا۔ ویسی ہی مست آنکھیں، ویسے ہی سنہرے بال —

''بار بار بچے کو مت دیکھو بی بی، بھولنا مشکل ہو جائے گا۔ بابا جی آپ کو پھر یہاں کبھی نہیں آنے دیں گے۔''

سسٹر نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا تو میں پھر رو پڑی۔

''اب یہ ڈھونگ رچانا ہے تو مر جا یہیں۔ اس حرامی پلے کو پال۔ گلیوں میں بھیک مانگتی پھرے گی۔ کسی کوٹھے پر بیٹھنا پڑے گا۔''

ماں کے پیچھے کھڑی ہوئی چاچی غصہ میں بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

''جان جوکھوں میں ڈال کر یہ دن کاٹے ہیں'' — ماں کو بھی بہت غصہ آ رہا تھا۔

''اب اس بلا سے پیچھا چھوٹا ہے تو ٹسوے بہا رہی ہے اپنے کرموں پر۔''

''ہاں اور ابھی بگڑا ہی کیا ہے!'' چاچی میرے آنسو سے گھبرا کر سمجھانے لگی — ''ملیشم جیسا لکھ پتی آدمی مل گیا ہے، نصیب کھل جائیں گے۔''

ماں میرا ہاتھ پکڑ کر لے چلی تو میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

اس نے اپنے منہ سے کپڑا ہٹا دیا تھا اور خالی خالی نظروں سے چاروں طرف جانے کیا دیکھ رہا تھا، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

ہم دروازے تک آئے تو وہ زور زور سے رو رہا تھا۔

''ماں وہ بھوکا ہے شاید'' مگر ماں نے میرا ہاتھ پکڑ کے آگے کھینچا اور آیا کو پچاس روپے دے کر بولیں ''اپنا منہ بند رکھنا۔''

ہم کار میں بیٹھ گئے تو چاچی نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

''آج میں تو مندر جاؤں گی، ہے بھگوان تیری کرپا سے کتنی بڑی مصیبت ٹل گئی۔''

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ کتنی خاموشی تھی۔ وہ طوفان کیا ہوا جو ہر وقت مجھے دہلایا کرتا تھا۔ جس وقت وہ پوری قوت سے کروٹ بدلتا تو خوف کے مارے میری چیخ نکل جاتی تھی۔ جیسے ساری دنیا یہ تماشہ دیکھ رہی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ بے ایمان اجمل امریکہ میں گل چھرّے اڑا رہا ہوگا۔ مجھے کتنے دھوکے میں رکھا اس نے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ پورا انتظام کرلیا ہے۔ بس اب شادی کر کے یورپ لے جاؤں گا۔ مجھے اس کی بات پر یقین نہ تھا مگر پھر بھی اس کی طرف سرکتی گئی۔ وہ تھا ہی ایسا پُرکشش، اس سے زیادہ خوبصورت مرد میں نے پھر کبھی نہ دیکھا۔ وہ میرا لیکچرر تھا۔ مگر ہمارے بیچ سے دوری کے سارے فاصلے مٹ گئے تھے۔ پھر ایک دن وہ ملازمت چھوڑ کر مجھ سے کچھ کہے بنا چپکے سے پلین میں سوار ہوگیا۔ ابھی میں اس کی وعدہ خلافی پر جھنجھلا رہی تھی کہ میرے پیٹ میں پھڑکن شروع ہوگئی۔ مچھلیاں سی تیرتی پھرتیں۔ ایک دن کتاب پٹک کر میں ماں کے پاس بھاگی تھی۔

''کہاں — کہاں'' —؟ ماں نے سینا پرونا چھوڑ کر عینک نیچے سرکائی۔

''یہاں —'' میں نے سیدھی کوکھ پر ہاتھ رکھا۔

''اوئی، مجھے بڑی گدگدی ہو رہی ہے۔''

ماں گھبراہٹ کے مارے کھڑی ہوگئی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور جلدی سے چاچی کے پاس بھاگی۔

میری چاچی بڑی تجربہ کار عورت تھی۔ اس کی موجودگی میں کبھی گھر کی عورتوں کو ڈاکٹروں، دوائیوں کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ کنواریوں، بیاہیوں کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اس نے مجھے

چت لٹا کر پیڑو پر ہاتھ رکھا اور ماتھے پر ہاتھ مار کے ماں سے بولی۔

''ہے ہے سوریہ کی بہو تیرے بھاگ پھوٹ گئے۔''

اور پھر ماں کے ساتھ ساتھ میں بھی خوف کے مارے رونے لگی۔

میرے آگے بھیانک مستقبل کی خوفناک چڑیلیاں ناچ رہی تھیں۔پتا جی کی قہر آلود نظریں، کالج کے ساتھیوں کا زہریلا طنز، میری ادھوری تعلیم، خاندان کی عزت، میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟

چاچی نے مجھے زہر سے زیادہ کڑوی دوائیں کھلائیں۔میں نے کھالیں۔انہوں نے اپنا دومن وزنی بوجھ میری کمر پر ڈال کر کودنا شروع کیا اور میں ضبط کئے پڑی رہی وہ مجھے چھت پر لے گئیں اور نیچے جھکا کر کہا۔

''کود — نیچے کود جا۔''

''کہاں''میں ڈر کے مارے رونے لگی۔''

''نرک میں اور کہاں — ! کودتی ہے منحوس یا زندگی بھر سولی پر ٹنگی رہے گی!''

اور میں آنکھیں میچ کے کود پڑی۔میرے سیدھے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا بس اور کچھ نہ ہوا۔میرا جی چاہتا تھا کہ اپنا پیٹ چاک کر کے اسے نکال پھینکوں۔نفرت کے مارے سارے بدن میں آگ سی سلگا کرتی تھی میں کھانا نہ کھاتی کہ وہ مر جائے، پانی نہ پیتی کہ وہ پیاس سے ترسے۔مگر اس نے مجھے کہا سے پکڑا تھا کہ کسی طرح نہ چھوڑا۔پتا جی نے سنا تو مجھ سے کچھ نہ کہا۔مگر ماں کو مجبور کرتے رہے کہ اجمل کو زبردستی بلا کر مجھے اس کے حوالے کر دیں۔لیکن ماں ایک مسلمان کو داماند بنانے پر راضی نہ ہوئی۔اس نے جانے کتنی بھاگ دوڑ کی اور آخر مجھے بابا جی کے ہوم پہنچا دیا۔گھر میں سب سے کہہ دیا کہ میں موسی کے پاس پونہ جا رہی ہوں۔

سنا ہے بابا جی نے اپنی ساری دولت جھونک کر یہ ہوم کھولا تھا۔تا کہ مجھ جیسی مائیں اپنے بچے کا گلا گھونٹنے کی بجائے بچہ انھیں دے جائیں۔پھر وہ بچہ ان کا ہو جاتا تھا۔وہ اسے کسی لاولد کے ہاتھوں بیچ دیتے یا پھر ہوم کے دوسرے بچوں کے ساتھ پالتے تھے اور یہ سارا کام بڑی رازداری کے ساتھ ہوتا تھا کہ ماں صاف بچ کے نکل جاتی۔جس دن بابا جی کے ہوم میں جا کر میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا ہے تو میں کیسے مہیب خطروں سے محفوظ ہو گئی تھی۔بابا جی نے میرے

اوپر کتنا بڑا احسان کیا تھا۔ دو چار مہینے میں پھر کالج جا سکوں گی۔ ایم اے کرلوں گی، میرا کوئی گھر ہوگا، کوئی پتی ہوگا۔

ایک ایک دن پہاڑ ہو گیا تھا۔ اکیلے کمرے میں لیٹی میں کورس کی کتابیں پڑھے جاتی تھی۔ کہتے ہیں پہلا بچہ پیٹ میں ہو تو عورت بہت خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس کے خوابوں میں رنگ بھر جاتے ہیں، اسے ہر بات اچھی لگنے لگتی ہے، یہ سب کتنی غلط باتیں تھیں۔ میرے تو چہرے سے ہر رنگ اڑ چکا تھا۔ خوابوں میں ڈراؤنی شکلیں مجھے ڈراتی تھیں۔ مجھے ساری دنیا سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ گھر میں کتنی بار میں نے زہر کھانے کا ارادہ کیا مگر ہر بار ماں کی چوکسی کام آ گئی۔ کبھی سوچتی اجمل کو ایک خط لکھوں، اور اسے بتاؤں کہ اس کے جھوٹ کی سزا میں نے اس کی اولاد کو دی ہے، اس کے منہ پر کیسا تھپڑ مارا ہے۔

افوہ ——— اس بچے نے پیدا ہوتے وقت مجھے کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔ آج تک کسی عورت نے وہ دکھ نہ اٹھایا ہوگا جو میں نے اٹھایا۔

کہتے ہیں بچے کی صورت دیکھ کر ماں اس کی پیدائش کا درد بھول جاتی ہے مگر میرا دکھ تو اور گہرا ہوتا گیا۔

گھر آئی تو ماں نے ٹائیفائیڈ کا ڈھونگ رچا کے دو مہینے تک بستر پر لٹائے رکھا۔ پھر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ کالج جانے لگی میں نے ایم۔اے کا امتحان دیا۔ اور پھر ملیشم ہمارے دروازے پر برات لے کر آ گیا ——— اس نے میرا گھونگھٹ اٹھایا تو میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ میرے پیٹ میں گدگدیاں سی ہونے لگیں۔ یہ بات میں نے ماں سے کتنی بار کہی تھی کہ میرے پیٹ میں ابھی تک گدگدی ہوتی ہے۔ بعض وقت اچانک چھاتی میں درد اٹھتا پھر میرا بلاؤز بھیگ جاتا تھا۔ ایک دن بھابھی کسی سے کہہ رہی تھی کہ بچہ بھوکا ہو تو ماں کا یہی حال ہوتا ہے۔ مگر ماں مجھے ڈانٹتی کہ میں یہ بات کسی کے سامنے نہ کہوں۔ حالانکہ میں تو اس کتے کی اولاد کو کبھی یاد نہ کرتی تھی۔ میں تو ادھر منہ کر کے تھوکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں تو بڑے چاؤ سے بڑے ارمانوں سے ملیشم کی دلہن بنی تھی۔ شرماتی لجاتی سہمی سہمی سی ایک کونے میں بیٹھی تھی اور ملیشم ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔

''تو کتنی پگلی ہے۔ اتنی بڑی ہو گئی مگر بڑی بھولی ہے۔''

ہمارے بیاہ کو چار برس ہو گئے۔ ان برسوں کا ایک ایک دن کیسی بے صبری سے گزارا

ہے میں نے۔ ملیشم بار بار میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا اور میں گردن جھکا لیتی تھی۔ میرے ساتھ جن لڑکیوں کے بیاہ ہوئے وہ تین تین لڑکیوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ ماں نے بڑی منتیں مانیں، ہر بڑے مندر میں جا کر سر جھکایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک بار انہوں نے میری کوکھ اجڑنے کے لئے ہر مندر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

ہمارے ساتھ والے بنگلے میں احمد اللہ خاں رہتے تھے۔ سات بچے تھے ان کے اور آٹھواں ہونے والا تھا اور اس آنے والے بچے کے استقبال کی تیاریاں مسز خان یوں کر رہی تھیں جیسے پہلوٹھی کا بچہ آ رہا ہو۔

میرے چھیڑنے پر وہ برا مان کر کہتیں۔

''بہن میرے کوئی حرام کی اولاد تو ہے نہیں جو میں روتی پھروں، میرے میاں کو بہت سے بچے چاہئیں تو میں ان کی خوشی پوری کرتی ہوں۔''

ملیشم نے مجھے شہروں شہروں لے جا کر ڈاکٹروں کو دکھایا۔ مگر چاچی نے مجھے جانے کون سی آگ پلائی تھی جس نے میرے اندر اگنے والے سارے پودے جلا ڈالے تھے۔

پھر ایک دن ہمارے ہاں مسٹر اور مسز خاں آئے تو انہوں نے باتوں باتوں میں ملیشم سے کہا۔

''ہمیں آپ کا سونا گھر اچھا نہیں لگتا۔ ایسے بہت سے لوگ تو یہ کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں رشتے داروں میں کہہ دیا کہ ہمارے ہاں بچہ ہونے والا ہے اور جا کر بابا جی کے ہوم سے ایک بچہ لے آئے۔ میرے ایک دوست نے یہی کیا تھا۔''

خان صاحب کی باتیں سن کر میں خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ میرے سینے میں پھر درد ہونے لگا اور میں ملیشم کے پیچھے پڑ گئی۔ میں ہوم سے اپنا بچہ لاؤں گی، میں ہوم جاؤں گی۔ لیکن ملیشم مرد تھا۔ وہ ایسے حرامی بچوں کو پالنے کے لئے کافی سوچ و بچار سے کام لینا چاہتا تھا۔ مگر میرے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

آج پانچ برس کے بعد میں پھر اسی ہوم میں تھی۔

میرے چاروں طرف بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور میں سوچ

رہی تھی کہیں اسے کوئی لے نہ گیا ہو۔ ان میں وہ کون سا ہوگا، جانے وہ مجھے مل بھی سکے گا یا نہیں!

پھر وہی پرانی آیا نظر آئی۔ اس نے مجھے ہنس کر سلام کیا اور ملیشیم کی طرف دیکھ کر بڑے تشویش ناک لہجہ میں بولی۔

''کیا پھر ——؟''

''نہیں نہیں'' میں نے سہم کر اس کا ہاتھ دبا دیا۔

''یہ میرے پتی ہیں۔'' اور پھر میں آیا کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

''آیا، میں اسے خریدنے آئی ہوں جس قیمت پر بھی ملے۔ کہیں وہ بک تو نہیں گیا۔''

''ممکن ہے اسے کوئی لے گیا ہو۔ میں تو اب بھول گئی۔ رجسٹر میں اس کا نمبر اور تاریخ پیدائش دیکھنا پڑے گی۔''

پھر وہ کہنے لگی —— ''بس مجھے اتنا یاد ہے کہ بہت چھوٹا تھا تو آپ کا بچہ بہت خوبصورت تھا مگر بیمار بہت رہتا تھا۔ ساری ساری رات روتا تھا، اس نے ہمیں بہت ستایا۔''

ایک گھنٹے تک وہ رجسٹر الٹ پلٹ کرتی رہی، پھر مسکرا کر بولی۔

''اچھا وہ نہیں بکا۔ وہ رہا نمبر ۱۱ کھڑکی کے پاس۔''

میں بے تابی کے ساتھ اٹھی اور اس کے پاس چلی گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کی جالی پکڑے باہر کچھ دیکھ رہا تھا۔ چپ چاپ، سہما سہما سا، دبلا پتلا اس کی صورت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے آنسو پونچھ کر آیا ہو۔

''جوائے —— آنٹی کو وِش کرو۔'' آیا نے کہا، اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''یہ بڑا ضدی بچہ ہے۔ کبھی بات نہیں سنتا، سب سے زیادہ اسے مارتے ہیں۔ مگر یہ پھر بھی قابو میں نہیں آتا۔'' —— ایک اور آیا ہمارے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

''یہ بہت چھوٹا تھا جب وہ تین بار لوگ اسے خرید کر لے گئے'' بہت خوبصورت ہے نا۔ مگر اتنا ضدی اور بیمار ہے کہ سب نے اسے واپس کر دیا'' ——

''میرے پاس آؤ بیٹا'' میں نے آنسو پونچھ کر بڑی مشکل سے کہا۔

مگر وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا اور زور سے بولا۔

''نہیں — نہیں — میں کیوں آؤں — جاؤ بھاگ جاؤ۔''

اتنے میں باباجی ملیشم کو لے کر آ گئے۔

''بڑی دیر لگا دی تم نے بچے کے انتخاب میں''، ملیشم نے کہا تو میں بے تابی سے اس کی طرف بڑھی۔

''مجھے یہ بچہ پسند ہے۔ بس اب یہ میرا ہے'' میں نے اسے گود میں لینا چاہا تو وہ چیخ مار کے بھاگا اور زور زور سے رونے لگا۔

''دیکھا کیسا بچہ پسند کیا۔ بالکل اپنے جیسا''، ملیشم نے ہنس کر باباجی سے کہا، اور پھر غور سے دیکھ کر کہا۔

''مگر یہ تو کچھ بیمار معلوم ہوتا ہے۔''

''نہیں بیمار نہیں ہے۔'' باباجی نے میری طرف دیکھا۔

''اب آپ کچھ مت کہئے آپ کی بیوی بڑی لکی ہے مسٹر ملیشم، اسے اپنا بچہ مل گیا ہے۔ مگر یہ بچہ تھوڑا سا سرکش ضرور ہے، یہ ہمارے ہوم کا سب سے زیادہ ضدی بچہ ہے، ہر وقت کیوں کیوں کی رٹ لگائے رکھتا ہے، اسے پالنے کے لئے آپ کو زیادہ وقت دینا ہوگا۔

''دیں گے۔''، ملیشم نے کہا۔ ''اگر ہمارے پاس وقت کی فراوانی نہ ہوتی تو آپ کے پاس کیوں آ گئے؟'' وہ دونوں ہنسنے لگے، مجھے بھی آج کتنی ہنسی آ رہی تھی میرے دل کی کلی کھلی جا رہی تھی۔

میں بہت تھوڑے پیسوں میں بیچا گیا تھا۔

یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب وہ لوگ مجھے کار میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جانے لگے اس موٹے کالے آدمی نے تھوڑے سے نوٹ باباجی کے ہاتھ میں تھما دیے۔ باباجی نے وہ نوٹ اپنے کُرتے کی جیب میں ڈال کر مجھے پیار کیا اور میرے گلے میں سے ہوم کا نمبر اتار کر بولے۔

''جاؤ بیٹا — ان لوگوں کے ساتھ خوش خوش رہنا — آج سے تم جوائے نہیں، انیل ہو'' —

''کیوں — کیوں باباجی۔ میں جوائے کی بجائے انیل کیسے ہو گیا۔ آپ نے میرا نمبر

کیوں اتار لیا، اب میں کھو جاؤں گا، نمبر کے بغیر مجھے کوئی کیسے بچائے گا؟''

''تم ہمارے پاس رہو گے بیٹا — اپنی ممی کے ساتھ رہنا۔''

اس موٹے کالے آدمی نے مجھے اٹھا کر زبردستی موٹر میں بٹھایا تو میں رو پڑا — مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا کہ جانے یہ لوگ مجھے باباجی سے چھین کر کیوں لے جا رہے ہیں۔ حالانکہ مجھے موٹر میں بیٹھنے کا بڑا شوق تھا۔ مگر شاید میں اس بات پر رونے لگا کہ اس آدمی نے مجھے بیٹا کیوں کہا اور ممی کون ہے؟ میرے پاس کار میں ایک گوری سی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ سرخ آگ تھے۔ وہ بار بار ہنس ہنس کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ مجھے کھا نہ لے۔ ایک بار آیا نے بچوں کو ایک کہانی سنائی تھی، چڑیل کی کہانی۔ اس کے منہ سے سرخ آگ نکلتی تھی اور وہ شریر بچوں کا کلیجہ کھا لیتی تھی۔

موٹر کے دھچکوں سے میں اچھل رہا تھا۔ تیز ہوا میں میرے بال اڑے جا رہے تے۔ سامنے اتنی لمبی سڑک تھی جس کا آخری سرا کہیں نہ تھا۔ اتنی بڑی سڑک پر چلتے چلتے تو میں ضرور کھو جاؤں گا۔ ہمارے آس پاس بہت سے لوگ کہیں بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔ سائیکلوں پر، موٹروں میں، رکشوں میں، پیدل، مجھ سے تو اتنی جلدی جلدی کبھی نہیں چلا جائے گا۔ آج اتنے بہت سے مکان، سڑکیں درخت اور آسمان جانے کہاں سے آ گئے تھے۔ ہوم کی کھڑکی سے تو آسمان صرف جنگلے تک نظر آتا تھا۔ پانچ ہی درخت تھے وہاں اور سورج لڑکیوں کے ہوم کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ مگر آج، موٹر مجھے جانے کہاں لے جا کر پھینک دے گی کہیں زمین کا آخری کونہ نہ آ جائے۔

میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں، وہی کالا آدمی مجھے کاندھے سے لگائے ایک مکان کے اندر جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے وہی سرخ ہونٹوں والی عورت چل رہی تھی۔ ہنستی ہوئی۔ جانے کیوں مجھے یہ عورت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا وہ میری طرف کبھی نہ دیکھے۔ اس گھر میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ انہوں نے باری باری مجھے دیکھا۔ پیار کیا — مگر ایک سفید بالوں والی بڑھیا سے مجھے اور بھی ڈر لگ رہا تھا۔ یہ تو ضرور کہانی والی جادوگر بڑھیا ہے جو بچوں کو پتھر بنا دیتی ہے۔

''ماں میں اپنا بچہ لے آئی'' سرخ ہونٹوں والی بڑھیا سے لپٹ گئی۔

''کیا یہ وہی ہے'' —؟ بڑھیا نے مجھے گود میں لے کر غور سے دیکھا تو میں پھر رونے لگا اور اس کی گود سے اتر گیا۔

''آؤ۔۔۔اب ہمارے پاس آؤ۔'' اس کالے مرد نے کہا تو میں ڈر کے مارے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

''ہائے بیچارے یتیم بچے روتے ہوں گے تو دیواروں سے چمٹ جاتے ہوں گے۔'' جانے کس نے کہا۔

''بڑی بُری رکھتی ہیں ہوم کی آیا ئیں۔ مار مار کے بُرا حال کر دیتی ہیں۔

''میرا نمبر کیوں چھین لیا۔'' میں اچانک رونے لگا ''نمبر کھو جائے تو آیا لکڑی سے مارتی ہے، کھانا نہیں ملتا۔ بچھونا، رکابی، گلاس سب چھین لیتے ہیں۔''

''تم اب نمبر کا کیا کرو گے انیل۔ آؤ ہم تمہیں بہت سی چیزیں دیں گے۔''

کالے آدمی نے کہا اور مجھے گود میں اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ مجھے بھی اب یہ آدمی بہت اچھا لگنے لگا تھا۔ اس نے میرے لئے بہت سے کھلونے الماری میں رکھے تھے۔ اچھے اچھے کپڑے اور طرح طرح کے چاکلیٹ۔۔۔اس نے ایک چاکلیٹ میرے منہ میں رکھا اور پورا ڈبہ میرے ہاتھ میں دیدیا، میں گھبرا کے آیا کو ڈھونڈنے لگا۔

ہوم دیکھنے کے لئے آنے والے اکثر لوگ ہمیں کوئی چیز دے جاتے تھے۔ مگر آیا وہ چیزیں ہم سے چھین کر رکھ دیتی۔ پھر بابا جی آتے ہیں تو سب بچوں کو نمبروں سے پکارا جاتا ہے تب وہ چیز ہمیں ملتی۔

''انیل کو دودھ پلا دوں۔'' وہی سرخ ہونٹوں والی ایک گلاس لیے اندر آئی۔

''کیوں۔۔۔ کیوں آج میں دودھ پیوں۔۔۔؟'' میں پھر رونے لگا۔

''میرے ہاتھ سے دودھ نہیں پئے گا میرا بیٹا۔۔۔ میں تمہاری ممی ہوں نا۔''

''کیوں۔۔۔ کیوں ہیں میری ممی'' مگر میں دل میں سوچ رہا تھا کہ اس چڑیل کی بات تو کبھی نہ مانوں گا۔ یہ کسی دن ضرور میرا کلیجہ پھاڑ کے کھا لے گی اور اس بڑھیا جادوگرنی کو کھا دے گی کہ مجھے پتھر کا بنا دے۔

جانے بابا جی نے مجھے یہاں کیوں بھیج دیا۔ میں ہوم کب جاؤں گا۔ میرے اتنے رونے دھونے پر بھی وہ عورت زبردستی مجھے گود میں اٹھا کے ایک کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھا دیا۔ سامنے میز پر کھانے کی بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ مٹھائیاں، پھل اور جانے کیا کیا چیزیں۔

اتنی بہت سی کھانے کی چیزیں میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ اگر یہ سب مجھے کھانے کو مل جائیں تو ابھی کھالوں — مگر میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

''تم کیا کھاؤ گے بیٹا، تمہیں کونسا پھل اچھا لگتا ہے۔'' اس آدمی نے پوچھا تو میں نے رکابی میں سے ایک اچھا سا پھل اٹھالیا پھر ایک اور لے لیا۔ جب اس پر بھی کسی نے کچھ نہ کہا تو میں نے چپکے سے مٹھائی کی پلیٹ اپنے سامنے سرکالی اور پھل گود میں رکھ کر جلدی جلدی مٹھائی کھانے لگا۔ میز پر ایک اور بڑی اچھی چیز ایک بڑی سی رکابی میں رکھی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے ہاتھ ڈال کر اسے چاٹ لیا۔ لیکن میری اس حرکت پر سب چلا پڑے — اس آدمی نے کہا — ''چمچے سے لو بیٹا، ایک چیز پہلے ختم کرلو، یہ سب تمہیں کھانے کو ملیں گی۔''

''یہ سب میں کھالوں —؟'' مجھے اس گھر میں آکر پہلی بار خوشی محسوس ہوئی، جلدی جلدی کھانے کی کوشش میں کیلا میرے حلق میں پھنس گیا۔ میں نے گردن اوپر اٹھائی سامنے دیوار پر ایک تصویر لگی تھی ایک عورت ایک چھوٹے سے بچے کو پیار کر رہی تھی۔ یہ عورت جانے کیوں بچے کو پیار کر رہی ہے۔ شاید وہ بھی اس بچے کی ممی بننا چاہتی ہے۔ جب عورتیں ممی بننا چاہتی ہیں تو بچوں کو پیار کیوں کرنے لگتی ہیں!

اس عورت نے بسکٹ اٹھا کر میری پلیٹ میں ڈال دیے اور بڑے پیار سے بولی ''میرا راجہ بیٹا کتنا بھوکا تھا'' پھر مجھے اچانک یاد آیا کہ میں بغیر نمبر کے کھانے بیٹھ گیا ہوں۔ اگر آیا نے دیکھ لیا تو مجھے بہت مارے گی، بس جلدی سے اٹھ کر بھاگا۔

''میں اپنا نمبر لے آؤں۔ نہیں تو آیا مارے گی۔''

مگر اس آدمی نے مجھے پکڑ لیا اور وہ عورت جانے کیوں میری بات پر رونے لگی۔

''ان باتوں کو بھول جاؤ بیٹا'' وہ آدمی میرے منہ میں نوالہ دینے۔ لگا۔ ''اب تم کبھی ہوم نہیں واپس جاؤ گے، تمہارا نمبر کوئی نہیں پوچھے گا۔''

''تو پھر میں ضرور کھو جاؤں گا'' میں نے گھبرا کے کہا۔

''میں جو ہوں تمہارے ساتھ، دیکھو تمہاری ممی نے تمہارے لئے کتنی اچھی چیزیں پکائی ہیں'' پھر وہ روتی ہوئی عورت کو سمجھانے لگا۔

''بس کرو...... تمہارے رونے سے انیل گھبرا جائے گا۔ ذرا ان پتھر دل ماؤں کے

بارے میں سوچو جو اپنی اولاد کو ہوم میں چھوڑ کر چلی جاتی ہیں، سچ کہتا ہوں، ان بچوں کو ہوم میں دیکھ کر میرا تو ماں کی ممتا پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔''

''مگر ہمارے ہوم میں ممی نہیں آتی۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''سب بچے آسمان پر سے گرتے ہیں تو یسوع مسیح انہیں اٹھا کر ہوم پہنچا دیتے ہیں۔''

میری بات پر سب کو ہنسی آ گئی، جانے کیوں—؟

شاید یہ لوگ مجھے جھوٹا سمجھ رہے تھے۔

ایک دن میرا انیکر پھٹ گیا تھا تو آیا نے مجھے اندھیرے کمرے میں اکیلا بند کر دیا تھا۔ میں وہاں بیٹھا خوب روتا رہا۔ مجھے اندھیرے سے بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے چاروں طرف ٹٹولا تو الٹا ہاتھ میرے سیدھے ہاتھ میں آ گیا، اپنے ہی ہاتھ کو میں نے خوب کس کے تھام لیا اور میرا رونا خود بخود تھم گیا۔ مگر ذرا دیر بعد مجھے اندھیرے میں ایک چڑیل نظر آئی۔ میں پھر رونے لگا میں نے چلا چلا کے اپنے ساتھ کھیلنے والے اوم،— جوزف— محمد— سب کو پکارا، مگر کسی تک میری آواز نہ پہنچی۔ شاید آج ان سب کو اندھیرے کمروں میں بند کر دیا تھا۔ پھر میں زور زور سے دروازے سے سر مار کر رونے لگا اور گر پڑا— پھر میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ایک نرس میری آیا سے خوب لڑ رہی تھی۔

''اب کبھی میرا کہنا نہیں مانو گے تو پھر اسی طرح اندھیرے کمرے میں بند کر دوں گی۔'' میری آیا نے غصہ میں کہا تو میں ڈر کے مارے رونے لگا۔ بس پھر کیا تھا، مجھے روتا دیکھ کر اسپتال کی نرس کو آیا پر غصہ آ گیا۔

''میں تمہارے اوپر ایک کیس چلاؤں گی، تمہارے ہوم پر ایک کمیشن بٹھاؤں گی اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں پر اتنا ظلم— میں اس بچے کو اسپتال سے نہیں جانے دوں گی۔''

میں اور ڈر گیا۔ جانے سب عورتوں کو غصہ کیوں آتا ہے۔

''بڑی ہمدردی ہے تمہیں ہوم کے بچوں سے۔ شاید تمہارے بچے بھی وہاں پل رہے ہیں۔ دیکھتی ہوں تم بچے کو کیسے نہیں جانے دو گی؟'' سب عورتیں کتنی خراب ہوتی ہیں۔ ہمارے ہوم کی تو سب آیائیں بہت خراب تھیں ہمارا کھانا خود کھا لیتی تھیں۔ کوئی بچہ بابا جی سے شکایت کر دے تو اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارتی تھیں۔ مگر جب بابا جی آتے تو ہمیں خوب پیار کرتیں۔ جیسے

آج سرخ ہونٹوں والی عورت سب کے سامنے مجھے پیار کر رہی ہے مگر سب چلے جائیں گے تو میرا کھانا چھین لے گی، میرا کلیجہ چباڈالے گی، مجھے اندھیرے کمرے میں بند کردے گی۔ میرا بس چلے تو سب عورتوں کو یسوع مسیح کے پاس واپس بھیج دوں ایک آیا کہتی تھی مجھے باباجی نے اس کالے آدمی کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اب میں کبھی ہوم واپس نہیں آؤں گا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو وہی سرخ ہونٹوں والی اور وہ بڑھیا میرے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ میں اٹھ کر بھاگنے لگا تو سرخ ہونٹوں والی نے مجھے زبردستی پکڑ کر اپنے خوشبودار سینے سے لگایا۔

''میرے لال۔ میرے بچے، میں نے تجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا، پھر مجھے کیوں پکڑتی ہو، چھوڑ دو۔''

''میں تیری ماں ہوں انیل، مجھے ممی پکار پھر میں تجھے چھوڑ دوں گی۔''

''ماں —— ماں کیا چیز ہوتی ہے۔'' میری سمجھ میں نہ آتا۔۔

کیوں کیوں کیوں کہوں میں تمہیں کبھی ممی نہیں کہوں گا، اب مجھے چھوڑ دو۔''

''ہے بھگوان، میں نے بڑا پاپ کیا ہے'' بڑھیا بھی اپنی آنکھیں پوچھ رہی تھی۔

''بیٹی۔ اسے کچھ نہیں معلوم کہ ماں کیا ہوتی ہے۔ محبت کیسی ہوتی ہے میں نے اپنی اولاد کو کہاں پھینک دیا تھا!

'' کیسے معلوم ہوتی'' اس عورت نے غصہ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

آخر ہے کس خودغرض سنگدل کی اولاد، اسے بھی کب معلوم تھا کہ محبت کیا ہے شرافت کس چیز کا نام ہے۔ کتے کی اولاد —— میں تجھے سیدھا کر کے رہوں گی۔''

وہ غصہ میں میری طرف بڑھی تو میں ڈر کے مارے دیوار سے چمٹ گیا اپنے بچاؤ کے لئے دیوار سے چمٹ جاؤ تو مارنے والے کی خوفناک صورت نظر نہیں آتی۔ اور آدھی چوٹ بھی دیوار کو لگتی ہے ہوم کے سب بچے پٹتے وقت یوں ہی ہاتھ پھیلا کے دیواروں سے چمٹ جاتے ہیں۔

''اب اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں چھڑی لے کر آؤں گی۔''

مگر اتنی دیر میں وہ کالا آدمی میری چیخیں سن کر اندر آ گیا۔

''بھئی اتنی کٹھور مت بنو۔ وہ بے چارہ محبت اور ممتا کیا جانے جب اس کی ماں نے اسے یہ چیز دی ہی نہیں۔''

''تو آپ ہی کوئی ترکیب کیجئے۔ یہ تو میری صورت سے بھاگتا ہے۔''

وہ چلاّئے جا رہی تھی۔

''بس اب رونا ختم کرو۔ یہاں کوئی نہیں مارے گا'' کالے آدمی نے مجھے اٹھا کر سینے سے لگایا تو مجھے بہت اچھا لگا۔

''مجھے ہوم بھیج دو۔'' میں نے سسکیاں روک کر کہا۔

''مگر ہوم میں تو آیا تمہیں مارتی ہے۔ کھانا نہیں دیتی۔ یہاں تو اتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ آج ہم تمہیں کار میں سیر کرانے جائیں گے، ہم تمہارے ڈیڈی ہیں نا ــــ اور یہ تمہاری ممی ہیں۔''

''مگر آپ کیوں ہوگئے میرے ڈیڈی ــــ''

میری بات سن کر وہ آدمی بہت گھبرایا اور کچھ نہ بولا۔

''میں تو یسوع مسیح کا بیٹا ہوں۔ پھر آپ مجھے اپنا بیٹا کیوں کہتے ہیں!''

''دیکھو یہ ریڈیو ــــ کھلونے ــــ چاکلیٹ، یہ سب تمہارے لئے ہے۔''

موٹا آدمی کہے جا رہا تھا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ یہ سب چیزیں میری کیوں ہوگئیں؟ مگر پہلے ٹی۔وی کھول کر ذرا دیکھ لوں کہ اس میں گانے والا آدمی کہاں چھپا بیٹھا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ یہاں سڑک کتنی بڑی تھی کتنی بہت سے موٹریں، سائیکلیں جا رہی تھیں اور کتنے بہت سے مکان ایک کو تھامے ایک کھڑے تھے جیسے ان مکانوں کا ساتھ چھوٹ گیا تو گر جائیں گے۔ سامنے والے مکان کے دوانڈے میں ایک عورت چھوٹے سے بچے کو گود میں لئے کھڑی تھی۔ اور بار بار بچے کے منہ پر اپنا منہ رکھ رہی تھی۔ وہ بچہ خوب رو رہا تھا۔ میں سمجھ گیا وہ عورت بچے کو کھانا چاہتی ہے۔

''نہیں نہیں ــــ چھوٹے بچے کو مت کھاؤ ــــ چھوٹے بچے کو مت کھاؤ۔'' میرے چلاّنے کی آواز سن کر ڈیڈی اندر آگئے۔

''بیوقوف وہ عورت بچے کو کیوں کھائے گی، وہ تو بچے کی ماں ہے۔ اسے پیار کر رہی ہے۔''

''نہیں ــــ آپ کو نہیں معلوم عورتیں چھوتے بچوں کو کھا لیتی ہیں۔ ان کا کلیجہ چبا ڈالتی ہیں۔ ایک دن ہوم کی آیا سے آپ کہانی سنئے۔''

مگر ڈیڈی میرے بات سن کر ہنسنے لگے اور پھر اس عورت سے بولے۔

''مسز خاں، ذرا اپنے بچوں کو ادھر بھیج دیجیے۔ ہمارا انیل ابھی آدمیوں سے ڈرتا ہے۔''

''گڈو — منی — پپو — جاؤ ملیشم چا چا تم سب کو بلا رہے ہیں۔''

اس عورت کے پکارتے ہی چار پانچ گورے گورے موٹے تگڑے بچے باہر بھاگتے ہوئے آئے ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ ان سب بچوں نے بڑے خوبصورت تسموں والے جوتے پہنے تھے۔ مجھے بھی جوتے پہننے کا بڑا شوق تھا مگر ہوم میں کسی بچے کو جوتے نہیں پہناتے۔ اس لڑکی نے پھولوں والا فراک پہنا تھا اس میں لال لال بٹن لگے تھے۔ وہ ایک ٹماٹر کھاتی ہوئی میرے قریب آئی۔

''تم یتیم خانے سے آئے ہو — تو — تمہارے ممی اور ڈیڈی نہیں ہیں — ؟ چہ چہ چہ — ہم تو روز اسکول جاتے ہیں — تمہیں کچھ پتہ ہے زو میں جو شیر ہے نا، اس نے ایک بچہ دیا ہے۔ کل ہماری آیا نے میرا ٹفن کھو دیا — وہ جو سامنے والے بنگلے میں پورنیا رہتی ہے نا، اس نے میری گڑیا چرا لی۔ تم اپنا کوئی کھلونا اسے مت دینا — تمہارا نام انیل کیوں ہے؟''

وہ لڑکی مجھ سے باتیں کیے جا رہی تھی اور ٹماٹر کا رس چوستی جا رہی تھی۔

''کیا یہ بہت مزے کا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''منی تھوڑا سا ٹماٹر مجھے بھی دے دو۔'' گڈو اس کے ہاتھ سے ٹماٹر چھیننے لگا۔

''نہیں دیتی۔ ممی سے چھپا کر لائی ہوں، ممی دیکھیں تو خوب ماریں گی۔''

وہ کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے اس کی ممی جا چکی تھیں۔

''تمہاری ممی بھی تمہیں مارتی ہیں! اب دیکھنا ایک دن وہ تمہیں کھا لیں گی۔''

''چل ہٹ، جھوٹا کہیں کا،'' منی ناک سکوڑ کے کہا۔

''میری ممی تو بہت اچھی ہے۔ وہ مجھے کیوں کھائے گی۔ تیری ممی ہو گی نکٹی چڑیل۔

''منی منی — انیل چٹی انٹی کا بیٹا تھوڑی ہے۔ اسے تو یتیم خانے سے خرید کر لائے ہیں۔'' گڈو نے مجھے سنانے کے لیے کہا۔

''تم لوگ کون سے ہوم سے آئے ہو۔'' میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''کیا پتہ'' — منی نے ٹماٹر کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھ کر جواب دیا۔ وا ور پھر منہ پر سے

بالوں کی لٹ ہٹا کر بولی۔

''ہماری ممی کو معلوم ہوگا۔''

''ہشت۔ہم کیوں آتے ہوم سے، ہم تو ممی اور ڈیڈی کے بیٹے ہیں'' گڈو نے کہا۔

''میں بھی ممی کا بیٹا ہوں'' میں نے فوراً طے کرلیا کہ سرخ ہونٹوں والی کو آج سے ممی کہوں گا۔

مگر میری بات سننے سے پہلے وہ سب کے سب چلاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بھاگے—ڈیڈی آگئے—ڈیڈی آگئے۔

''ڈیڈی آگئے۔ڈیڈی آگئے۔'' میں بھی ان بچوں کی طرح چلاتا ہوا اندر گیا اور ڈیڈی سے لپٹ گیا۔

ڈیڈی نے مجھے جلدی سے گود میں لے کر پیار کیا اور پھر دوسرے کمرے میں گئے۔

''چٹی، انیل سے تو اب ہماری دوستی ہوگئی۔ہم تو اب انیل کے ڈیڈی بن گئے ہیں۔''

''اور مجھے ممی نہیں کہو گے—؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''کہوں گا''—میں جلدی سے اس کی گود میں جا کر سینے سے لگ گیا۔مگر وہ جانے کیوں خوش ہونے کے بجائے رونے لگی۔

''اس اسے اپنی ہی اولاد سمجھ چٹی۔تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا نا کہ ہوم سے بچہ لے آئے تو رونا چھوڑ دو گی''—

ڈیڈی ممی کو سمجھنے لگے۔

''مگر دنیا جو نہیں مانے گی۔میں اسے اپنا بناؤں گی تب بھی کہاں بنانے دیں گے لوگ۔ہمارے گھر میں بچہ نہیں تھا تب بھی ہنستے تھے اب بھی ہنسیں گے۔''

''مگر دنیا سے ڈرو گی تو جینا مشکل ہو جائے گا، ہم اپنے بھلے کے لئے چاہے کچھ کریں، کسی کو کیا'' ڈیڈی نے ممی کو سمجھایا۔

''آپ مرد ہیں آپ ایسی باتیں سوچ سکتے ہیں۔مگر آپ کو کیا معلوم دنیا نے مجھے کٹھ پتلی بنا دیا ہے، میرے بچے کو میرا نہیں کہنے دیتی۔''

''اچھا اچھا، دنیا کو بکنے کو دو، بس اب جلدی سے اٹھو تیار ہو جاؤ، انیل کو آج زود کھانے

لے جانا ہے۔'' ڈیڈی نے ممی کو اٹھایا، رات کو میں سونے لیٹا تو مجھے اپنا ہوم بار بار یاد آرہا تھا۔ زو میں بندر، چڑیا، بھالو سب اپنے اپنے پنجروں میں بند تھے جیسے ہوم میں الگ الگ کمروں کے بچے الگ الگ کمروں میں بند کر دیتے ہیں۔ وہاں بھی لوگ یوں ہی ہمیں دیکھنے آتے تھے۔ ہمارے لیے پھل اور مٹھائیاں لاتے تھے، جیسے زو کے طوطوں اور بندروں کو مونگ پھلی اور چمنے کھلاتے ہیں۔

پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک طوطا بن کر زو سے اڑ گیا ہوں۔

— مگر اڑ کے کہاں جاتا! اوپر آسمان ہی آسمان تھا، نیچے لوگ پنجرے لیے کھڑے تھے۔ نہ اوپر جا سکتا تھا نہ نیچے اتر سکتا تھا۔ میں اڑتے اڑتے تھکا جا رہا تھا۔

دروازہ کھول دو — اب زو سے کبھی باہر نہ جاؤں گا مگر دروازہ بند ہو چکا تھا۔

''مجھے آنے دو — مجھے آنے دو'' میں زور زور سے چلایا تو ممی نے مجھے جھنجھوڑ کے کہا۔

''انیل، انیل، خواب میں کیوں رو رہے تھے بیٹا۔''

''ممی اب مجھے ہوم میں واپس کیوں نہیں جانے دیں گی؟''

جب ہم زو سے واپس آرہے تھے تو میں نے ڈیڈی سے کہا تھا، ڈیڈی، یہ زو بھی جانوروں کا ہوم ہے نا؟''

''دیکھو انیل، سب کے سامنے ہوم کا نام مت لیا کرو، سمجھے بیٹا'' — انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔

''تم تو اب ممی کے بیٹے بن گئے ہو نا؟''

''مگر میں تو یسوع مسیح کا بیٹا ہوں، آیا کہتی تھی'' —

''بھول جاؤ اس آیا کو'' — ڈیڈی نے ڈانٹ کر کہا، اور میں بھول گیا۔

اب میرے پاس اتنے بہت سے کھلونے تھے۔ میٹھے میٹھے چاکلیٹ ٹافیاں۔ جوتے اور پھولوں والے کپڑے، بعض وقت مجھے خیال آتا کہ ممی جوزف اور محمد کو اپنا بیٹا بنا کے ہوم سے لے آئیں تو کتنا مزہ آئے ان کے ساتھ خوب کھیلوں گا۔ گڈو اور پپو سے تو میری خوب لڑائی ہوتی تھی۔ صرف منّی میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ کبھی میں منّی کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا تو پپو بار بار منّی سے کہتا۔

''منی انیل تیرا چاک پیس چرا لے گا۔ تیرا ہاتھی توڑ ڈالے گا۔''

جی چاہتا تھا ایک دن پپو کو خوب ماروں۔ پھر ایک دن جب وہ منی کو میرے ساتھ کھیلنے

کے لئے نہیں جانے دے رہا تھا تو میں نے ایک پتھر اٹھا کر اسے مار دیا۔ مگر وہ مجھ سے بڑا تھا اس لئے اس کے گھونسوں سے میری نکسیر پھوٹ گئی اور میں گھر کو بھاگا ممی نے میری یہ حالت دیکھی تو بالکنی میں جا کر پپو کو خوب ڈانٹنے لگیں۔

''پہلے انیل نے پپو کو پتھر مارا۔'' — پپو کی آیا باہر آ کر پپو کی طرف داری کرنے لگی۔'' یہ تو اناتھ آشرم کا بالکل جنگلی لڑکا ہے۔ اسے ذرا ڈھنگ تمیز سکھایئے بی بی۔ ہمارے بچوں کو بھی خراب باتیں سکھاتا ہے۔''

''بکواس بند کرو'' ممی نے آیا کو ڈانٹ دیا، مسز خان آ جائیں تو تمہارا مزاج ٹھیک کروں گی۔''

اس دن مجھے بھی خیال آیا کہ سب مجھے برا بچہ اس لئے کہتے ہیں کہ میں سچ مچ برا ہوں۔ جبھی تو ڈیڈی کہتے ہیں کے سب کے سامنے ہوم کا نام مت لو۔

''تم منی کے گھر مت جایا کرو، اب تم اسکول جاؤ گے وہاں تمہیں بہت سے دوست مل جائیں گے'' ممی نے مجھے سمجھایا۔

''نہیں میں تو منی سے ضرور کھیلوں گا'' میں ضد کرنے لگا۔

''نہیں، تم آئندہ کبھی منی کے ساتھ نہیں کھیلو گے'' ممی نے چلاّ کے کہا۔

''کیوں، کیوں نہیں'' میں نے بھی زور سے جواب دیا۔

ممی جاتے جاتے رک گئیں۔ میرے قریب آئیں اور مجھے غور سے دیکھ کر بولیں'' ہے بھگوان بالکل ویسا ہی لگتا ہے۔ ضدی۔ اڑیل —''

میں منی کے گھر نہ جا سکوں اسی لئے ممی نے گیٹ پر بولٹ چڑھا دیا تھا۔ پہلے تو میں خوب رویا، جب ممی نے نہیں سنا تو گیٹ پر زور زور سے اپنا سر مارنے لگا۔'' دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو —''

''اتنی ضد۔ تو مجھے چین نہیں لینے دے گا'' ممی نے جلدی سے آ کر مجھے پکڑا، میرا خوف سے بھرا ہوا ماتھا اپنی ساری سے پونچھ کر کہا۔

''تم میرا کہنا نہیں مانو گے انیل —؟''

''نہیں میں آپ کی بات کبھی نہیں سنوں گا۔ میں تو منی کے پاس جاؤں گا مجھے

چھوڑ دو''— آج مجھے پھر ممی اپنی دشمن لگیں۔ وہ میری بات کیوں نہیں سنتیں۔

''میرا کہنا نہیں مانے گا تو لے— لے۔'' ممی نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں ان سے ہاتھ چھڑا کے روتا ہوا ڈیڈی کے کمرے میں بھاگا۔

''اسے گود میں مت لینا۔ بدتمیز— ضدی کو—'' ممی بھی ہانپتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آ گئیں۔

''تم نے آج پھر ممی کی بات نہیں سنی'' ڈیڈی نے مجھے گود میں اٹھانے کے بجائے غصہ کے ساتھ کہا۔

''چنی اسے اکیلے کمرے میں بند کر دو، جب تک یہ کہنا ماننے کا اقرار نہ کرے اسے مت کھولنا۔''

مگر آج مجھے اکیلے کمرے میں بالکل ڈر نہ لگا کیوں کہ کمرے میں اندھیرا نہیں تھا۔ جالی والی کھڑکی میں سے سڑک اور منی کا گھر نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں خوب اچھی اچھی چیزیں رکھی تھیں۔ مگر سب سے پہلے میں نے ٹرانسسٹر اٹھا کر اس کے کل پرزے کھولے۔ پھر ممی کا پرس اٹھایا اور اس میں سے سب چیزیں نکال کر بیٹھ گیا۔ لپ سٹک کی پنسل بنا کے میں نے دیواروں پر خوب تصویریں بنائیں۔ ممی کا پاؤڈر پورے بدن پر مل لیا۔ روپے گن کر الگ رکھ دیے۔ عطر کی شیشی کھول اپنے کپڑوں کو خوشبودار بنایا۔ پرس کی اندر والی تہہ میں ایک لفافے کے اندر ایک چھوٹی سی تصویر تھی کسی مرد کی۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں تھیں اس کی اور وہ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میرا جی چاہا اس تصویر کو پھاڑ کے پھینک دوں تاکہ ممی کو خوب سزا ملے۔ مگر پھر میں نے وہ تصویر اپنی جیب میں رکھ لی اور میز کے آئینے پر زور زور سے تیل کی شیشی مارنے لگا تاکہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ٹوٹ جائیں۔ شور سن کر ممی نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اندر آ کر انہوں نے غور سے اپنے پرس کے سامان کو دیکھا اور چپل لے کر مجھ پر پل پڑیں۔

''تو کبھی اچھا نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ مجھے اپنے باپ کی طرح جلائے گا ستائے گا'' مجھے زمین پر گرا کے جب ممی مار رہی تھیں تو جانے کب وہ فوٹو میری جیب سے نیچے گر پڑا۔ مجھے بچانے کے لئے ڈیڈی آئے تو مجھے گود میں اٹھا کر وہ فوٹو بھی اٹھایا۔ غور سے دیکھا پھر ممی سے پوچھا۔

''یہ فوٹو کس کا ہے۔ کہاں سے آیا—؟''

''میں کیا جانوں—'' ممی اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگیں۔

''پوچھو اسی حرامی سے، جانے کہاں کہاں سے چیزیں چراتا پھرتا ہے، پورے محلے میں مجھے بدنام کر دیا ہے اس نے۔''

''لو یہ فوٹو جہاں سے لائے تھے وہیں رکھ آؤ''—ڈیڈی نے مجھے پیار کر کے گود سے اتارا تو ممی نے جلدی سے اپنا پرس اٹھا لیا اور مجھے دیکھ کر غصہ سے بولیں۔

''خبردار جو میرے پاس آئے ،لاؤ فوٹو مجھے دے دو۔ میں مسز خان کو دے دوں گی۔ان ہی کے گھر سے اٹھایا ہوگا''

ممی اور ڈیڈی بھی مجھے چور سمجھتے ہیں۔ میں ہوم کا خراب بچہ ہوں۔اب کبھی اچھا بچہ نہیں بن سکتا اپنی حالت پر مجھے خوب رونا آیا۔

''اسے گھر لا کر میں نے پھر اپنے جیون کو روگ لگا لیا ہے، اسے واپس کر دیجئے''— ایک دن ممی نے ڈیڈی سے کہا۔

''ذرا صبر سے کام لو چٹی، اس عمر میں سب ہی بچے شریر ہوتے ہیں تم تو کسی بات پر قائم ہی نہیں رہتیں۔انیل کو اسکول میں داخل کر دو۔خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔''

جب مجھے اسکول جاتے ہوئے بہت دن ہو گئے تو ایک دن ڈیڈی نے ممی کو میری کلاس ٹیچر کا خط سنایا۔

> ''تمہارا بچہ سرکش ہے۔ٹیچروں سے نہیں ڈرتا۔ایسا لگتا ہے کہ انیل بے ماں کا ہے یا پھر اس کی ماں بچے کی تربیت بالکل بھلا بیٹھی ہے۔براہ مہربانی اسے اچھا بنانے میں ہماری مدد کیجئے اور اسے اپنا پیار بھی دیجئے کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے انیل پیار کا بھوکا ہے''—

''دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ انیل نہیں سدھر سکتا'' ممی نے چہک کر کہا، اور بڑی نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔فروٹ سلاد کا چمچہ میرے ہاتھ میں کانپنے لگا اور جانے کیوں اناس کے ٹکڑے میرے حلق میں پھنس گئے۔

''یہ مجھے زندگی بھر ہر جگہ ذلیل کرے گا۔ہونہہ دو کوڑی کی وہ ٹیچر چلی ہے مجھے ممتا کا سبق دینے۔کل اسکول جا کر اس کا مزاج ٹھیک کروں گی۔'' ممی غصہ کے مارے جانے کیا کیا بکے

جارہی تھیں۔ڈیڈی خاموش تھے اور پائپ پئے جا رہے تھے۔میرا جی چاہ رہا تھا اس وقت کسی طرح ڈیڈی مجھے اچھا بچہ کہہ دیں۔ ممی کو خوب ڈانٹیں۔ پھر اپنی ہتک آمیز رپورٹ پر مجھے رونا آ گیا۔اور میں چمچہ پلیٹ میں رکھ کر میز پر جھک گیا۔ممی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں میں کبھی اچھا بچہ نہیں بن سکتا۔ اسکول میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ دوسرے بچوں کی طرح شرارتیں نہ کروں۔مگر وہ ٹیچرس میری میرے اوپر دھونس کیوں جماتی ہے۔ ہر وقت ڈانٹ کر حکم دیتی ہے پھر مجھے بھی غصہ آ جاتا ہے اور میں اس کا کہنا نہیں مانتا۔سب بچے بھی مجھے دبلا سمجھ کر خوب مارتے ہیں۔میرا تو دل اسکول میں ذرا بھی نہیں لگتا۔صبح ممی زبردستی مار پیٹ کر کے مجھے اسکول بھیج دیتی ہیں۔وہاں میں کسی ٹیچر کی بات نہیں سنتا۔بس کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھتا رہتا ہوں کہ گیٹ میں ہماری کار کب آئے گی۔ ہر گھنٹی پر جا کے ٹیچر سے پوچھتا کہ کیا چھٹی ہوگئی ہے—!!

گھر آ کر بھی کسی کام میں دل نہیں لگتا ہے۔ممی سے تو اب مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ کسی دن سچ مچ میں مجھے ہوم واپس نہ بھیج دیں۔چھی چھی—ہوم کتنی گندی جگہ تھی۔اب مجھے ہوم کی سب باتیں یاد نہیں رہیں، مگر میں ممی کے گھر سے وہاں کبھی نہ جاؤں گا۔

ڈیڈی آفس کے کام سے کئی کئی ہفتے باہر رہنے لگے تھے۔کبھی گھر آتے تو ممی ذرا دیر کو انہیں نہیں چھوڑتی تھیں—جب دیکھو ڈیڈی کا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جاتیں۔میں دروازہ کھولنے کے لئے شور مچاتا تو وہیں سے کہتیں، جاؤ، انیل سڑک پر کھیلو، میں ابھی آتی ہوں۔

اور میں صحن میں جا کر مٹی کا گھر بنانے لگتا۔میرے سب کھلونے اب پرانے ہو چکے تھے۔پھل اور مٹھائیاں مجھے اب اچھی نہیں لگتی تھیں۔منی اور اس کے بھائی مجھ سے "کٹی" کر چکے تھے۔ممی پر بڑا غصہ آتا تھا کہ وہ مجھے ڈیڈی کے پاس کیوں نہیں جانے دیتیں!اب صرف ایک چھوٹا سا بچہ میرا دوست تھا جو سامنے جھونپڑیوں میں رہتا تھا۔ممی اسے اندر نہیں آنے دیتی تھیں۔ اس لئے وہ جالی والی کھڑکی میں آ کر باتیں کرتا۔اس نے مجھے سامنے کے میدان کے پیڑ سے سرخ پھولوں کے گچھے لا کر دیے تھے۔میں نے بھی ایک دن اسے اپنا چھوٹا سا پلین دے دیا۔یہ پلین بڑا اچھا تھا۔اس کے لائٹ جلتی تھی اور چابید دینے سے وہ اوپر اڑنے لگتا تھا۔مگر ایک دن ممی نے کھلونوں کی الماری میں وہ پلین نہ دیکھا تو مجھ سے پوچھا۔جب میں نے کہہ دیا کہ وہ پلین اپنے دوست کو دیدیا ہے تو ممی نے خوب شور مچایا۔

''کیوں دے دیا تو نے وہ پلین۔تو کون ہے کھلونے بانٹنے والا! خبردار میری اجازت کے بغیر کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔''

اس دن اپنے تکیے میں منہ چھپا کر میں خوب رویا۔ حالانکہ ممی نے مجھے نہیں مارا تھا۔ مگر ایسا لگا جیسے انہوں نے میرے سب کھلونے چھین لئے ہوں۔ میری کوئی چیز بھی نہیں رہی اب۔ ایک دن میں نے فرِج سے ایک ٹماٹر نکال کر کھالیا تھا تب بھی انہوں نے میرا کان پکڑ کر ایک تھپڑ مارا تھا۔

''تیرا ستیاناس ہو— ایک ہی تو ٹماٹر تھا— اب میں سلاد میں کیا ڈالوں، تیرا سر۔؟''

''وہ سب کھلونے تو میرے تھے۔ میری دونوں سالگرہوں پر ڈیڈی کے دوست لائے تھے۔ مگر ممی کہتی ہیں میری کوئی بھی چیز نہیں ہے۔

ایک دن میں اسکول سے آیا تو ممی اور ڈیڈی نہیں تھے۔ جب آیا نے میرا یونیفارم اتار کے دوسرے کپڑے پہنا دیے تو میں ادھر اُدھر خالی کمروں میں بھاگنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو جلدی سے میرے پاس آیا۔ ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھالیا۔

''تم کس کے بیٹے ہو—''

''میں ڈیڈی کا بیٹا ہوں۔ مجھے ہوم سے کوئی نہیں لایا۔ ہوم میں گندے بچے رہتے ہیں۔ میں تو ہمیشہ ممی کا کہنا مانوں گا۔''

میری بات سن کر اس آدمی نے مجھے گود میں اٹھالیا۔ کمرے میں شام کا اندھیرا ابھر گیا تھا۔ اس لئے وہ مجھے کھڑکی کی طرف لے گیا اور پردہ ہٹا کے غور سے میری صورت دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پوچھا۔''تم نے پہلے مجھے کبھی دیکھا ہے؟ میں نے سوچا انکار کردوں، مگر یہ آدمی مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور خوب گورا گورا سا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس آدمی کا فوٹو ممی کے پرس میں تھا۔

''آپ کا فوٹو ممی کے پرس میں ہے۔ ممی جھوٹ کہہ رہی تھیں کہ میں مسز خان کے ہاں سے چرا کے لایا ہوں، آپ بتائیے کہ آپ کا فوٹو کہاں تھا!''

''اچھا ٹھہریئے میں ابھی وہ فوٹو لاتا ہوں۔''

میں بھاگا بھاگا اندر گیا تو ممی کا کمرہ بند تھا اور صحن میں ایک کوا چھوٹے سے چڑیا کے

بچے کو کہیں سے پکڑ لایا تھا۔ اسے ٹھونگیں مار مار کے کھا رہا تھا۔ بچارا ننھا سا بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ میں نے کوے کو پتھر مار مار کے اڑایا۔ مگر وہ چڑیا کے بچے کو چونچ میں دبا کر اڑ گیا۔ میں روتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا تو ممی آ چکی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھیں۔ ممی کو روتا ہوا دیکھ کر میں سہم گیا اور پردے کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگا کہ اس آدمی نے ممی کو کیوں رلا دیا ہے مگر وہ آدمی ممی کے رونے کی پروا کئے بغیر مجھے دیکھے جا رہا تھا اور غصہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

''افوہ— مجھے کتنا بڑا دھوکا دیا۔ مجھے تم نے کیوں نہیں بتایا کہ تمہارے پیٹ میں میرا بچہ ہے۔ اللہ پاک کی قسم میں بھلا یورپ جا سکتا تھا آج مجھے کئی برس بعد معلوم ہوا ہے کہ میرا بچہ ایک ہوم میں پلا اور اب ایک ریڈی کے ہاں ہے—''

وہ آدمی اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

''مگر اب تم یہاں کیوں آئے ہو—؟ نکل جاؤ یہاں سے— ذلیل— کمینے—'' ممی زور زور سے چلانے لگیں۔

''تم نے مجھے دھوکا دیا— شادی کا وعدہ کر کے میری زندگی تباہ کی اور امریکہ چلے گئے۔ اس کے بعد کبھی تمہیں یاد ہی نہ آئی۔ میرا بس چلتا تو تمہارے اس تحفے کو پیروں سے مسل ڈالتی۔ تم نے میری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر چھوڑی تھی۔ وہ تو کہو میری ماں نے سہارا دیا، ورنہ آج میں کسی کوٹھے پر بیٹھی ہوتی اور''—

''بس بس— بہت سن چکا تمہاری بپتا— ایک لکھ پتی کی بیوی بنی بیٹھی ہو— مجھ سے بیاہ کر کے تمہیں کیا ملتا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ تمہاری نظریں صرف ملیشم پر ہیں— مگر میں اس بات کو ایک پل کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا بچہ ایک ہندو کے گھر میں پلے۔ جس دن سے میں نے یہ سنا ہے مجھے دل کے دورے پڑنے لگے ہیں— میں رات کو سو نہیں سکتا۔ میری بیوی حیران ہے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے— اس زیادتی کی کوئی حد بھی ہے۔ بھلا کوئی انصاف بھی ہے کہ میرا بچہ— میری اولاد وہ مجھے پکڑنے آیا تو میں چیخ مار کے باہر بھاگا۔

اچھا تو آج مجھے کہیں اور لے جانے کی تیاری ہو رہی ہے آخر میری کتنی ممی ہوں گی۔ کتنے ڈیڈی ہوں گے، وہ آدمی کہہ رہا تھا وہ میرا ڈیڈی ہے، بہت جھوٹا ہے وہ آدمی۔

میں جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر رضائی اوڑھ کر چھپ گیا۔ باہر سے ابھی تک ممی

اوراس آدمی کے لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔تھوڑی دیر بعد ممی میرے پاس آئیں اور مجھ سے لپٹ کر پھر رونے لگیں''میں اپنے ہاتھ سے تیرا گلا گھونٹ دیتی تو سب کو سکون مل جاتا۔''

''کیا آپ کو اس آدمی نے مارا ہے—ڈیڈی کو آنے دیجئے میں اس آدمی کی شکایت کر کے خوب پٹواؤں گا۔''

''چپ چپ—ڈیڈی سے اس آدمی کا ذکر مت کرنا—ورنہ تیرے ڈیڈی بھی مجھے ماریں گے''، ممی نے مجھے سمجھایا۔

''تو پھر اس آدمی نے آپ کو کیوں مارا۔میں بھی اسے ماروں گا۔''

مگر ممی نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے میرا منہ چوم کر کہا۔

''انیل—میرے بچے، کبھی باہر اکیلے مت جانا—وہ آدمی تجھے پکڑ کے لے جائے گا—''

''کیوں—کیوں لے جائے گا مجھے—؟''میں نے گھبرا کے پوچھا۔

''مجھے جلانے کے لئے۔وہاں اس کے بیوی بچے مل کر تجھے خوب ماریں گے وہ خود بعد میں پچھتائے گا تجھے لے جا کر۔مگر اسی وقت صرف مجھے جلانے کے لئے تجھے لے جانا چاہتا ہے۔''

''کیوں—ممی وہ مجھے کہاں لے جائے گا۔''میں ممی کی گود میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

''وہ کہتا ہے میں انیل کا ڈیڈی ہوں۔اس لئے انیل کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔'' ممی نے مجھے سمجھایا۔

''مگر میں تو اپنے ڈیڈی کا بیٹا ہوں نا۔ممی بتایئے نا میرا ڈیڈی کون ہے!''میری سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا یہ چکر۔

''کوئی نہیں ہے۔سب خود غرض ہیں۔تیرا ڈیڈی کوئی نہیں ہے''—ممی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

میرا ڈیڈی کوئی نہیں ہے۔ممی بھی میری نہیں ہے۔کھلونے بھی میرے نہیں ہیں۔جی چاہ رہا تھا پیروں پر پڑی ہوئی رضائی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔ممی کو لات مار کے نیچے گرادوں۔اس کمرے کی ہر چیز کو پھینک ڈالوں۔

اور پھر ایک دن وہی ہوا جس کا ممی کو ڈر تھا۔میں لال پھولوں کی کلیاں چننے کے لئے

سامنے والے میدان میں گیا تو وہاں وہی گورا گورا بڑی بڑی آنکھوں والا آدمی کار سے اترا، اور مجھ سے کہنے لگا۔

''آؤ بیٹے کار میں بیٹھ جاؤ، تمہیں ایک پکچر دکھائیں گے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے پٹوانے کے لئے مجھے لے جانا چاہتا ہے اس لئے میں ڈر کے مارے جلدی سے گھر کی طرف بھاگا۔

''ممی ممی، وہ چور مجھے پکڑنے آیا ہے۔ ممی جلدی چلو اسے ڈنڈے سے مارو''

مگر میری بات کسی نے نہیں سنی۔ گھر میں خوب شور مچا ہوا تھا۔ ڈیڈی اور ممی میں جانے کس بات پر لڑائی ہو رہی تھی۔ ممی خوب رو رہی تھیں اور ڈیڈی غصہ میں پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ممی کا گلا پکڑ کر کہہ رہے تھے۔

''سچ سچ بتا انیل تیرا بچہ ہے۔ جلدی بول — بتا کمینی —''

''نہیں نہیں'' — ممی رو رو کے کہہ رہی تھی۔

''یہ جھوٹ ہے انیل میرا بچہ نہیں ہے — یہ خط کسی نے تمہیں ستانے کے لئے لکھا ہے۔ انیل میرا بچہ نہیں ہے۔ میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں۔ ایشور کی'' —

لو آج ممی بھی کہہ رہی ہیں کہ میں ان کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں دکھ کے مارے رو بھی نہ سکا نہ کہیں بھاگنے کی ہمت رہی تھی۔

''آج میں تم دونوں کو مار ڈالوں گا۔ انیل کا بھی گلا گھونٹ کے پھینک دوں گا'' ڈیڈی کو مارتے مارتے تھکے جا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی میں جلدی سے باہر بھاگا۔ گیٹ کے باہر آیا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اس گورے آدمی کی کار میں بیٹھ کر چلا جاؤں۔ مگر وہ موٹر اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میرے پہنچنے تک اس کی کار کی سرخ لائٹ چمکتی نظر آ رہی تھی۔

''ٹھہرو — ٹھہرو — مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ'' میں کار کے پیچھے بھاگتا گیا — اور اس وقت رکا جب ایک پولیس کے سپاہی نے مجھے روک کر پوچھا تم کہیں سے آئے ہو — تمہارا گھر کہاں ہے۔ تمہاری ڈیڈی کا نام کیا ہے —

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی ڈیڈی نہیں ہے۔ ممی بھی نہیں ہے۔ منی بھی نہیں ہے۔ کھلونے بھی میرے نہیں ہیں'' — وہ پولیس والا سمجھ رہا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

اس لئے اس نے پہلے مجھے خوب ڈانٹا — پھر مارا — میری جیبوں کی تلاشی لی اور پوچھا کہ میں گھر سے کیا چُرا کے بھاگا تھا۔

اور جب پولیس والوں کو کسی طرح یقین نہ آیا تو انہوں نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا اور اخباروں میں میرا فوٹو چھپوا دیا کہ کوئی آ کر مجھے لے جائے میں خود اکیلے کمرے میں بیٹھا بیٹھا سوچتا تھا کہ جانے کون سے ڈیڈی اب مجھے لے جانے آئیں گے — مگر اب شاید کسی کو بھی مجھے اپنا بیٹا بنانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

انیل میرا دوست تھا۔

مگر جب کبھی میں نے اس سے کسی خلوص کا اظہار کیا وہ بگڑ بیٹھا۔ اسے ہر قسم کے رسمی تکلفات اور جھوٹی باتوں سے نفرت تھی۔ انتہائی تیز مزاج، مشکوک ذہنیت کا آدمی تھا۔ ہر ایک کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ہر بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا خصوصاً محبت پر اسے بالکل یقین نہ تھا۔ خواہ وہ ماں کی محبت ہو یا محبوبہ کی۔ ہر ایک سے لڑنے کو تیار رہتا۔ خاص طور سے ان لوگوں سے اس کی کبھی نہ بنتی تھی جو اس سے کسی خاص قسم کا خلوص ظاہر کرتے تھے۔

"ان ڈھکوسلوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہی کرو جس کی ضرورت ہے میں انیل کی اس سفاک اور کھدری شخصیت سے واقف تھا۔ اس کے باوجود اس میں جانے کیسی کشش تھی کہ میں ہمیشہ اس کے قریب پہنچ جاتا تھا — اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی، لمبا دبلا پتلا مگر بیحد ذہین۔ کلب میں ہماری ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر وہ بھی میرے کچھ قریب ہونے لگا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ واقعی اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ تنہا ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ میں نے کبھی وہاں اس کے رشتہ دار کو بھی نہیں دیکھا۔ کلب میں بھی اس کے بارے میں کسی کی اچھی رائے نہیں سنی۔ سب اس سے نفرت کرتے تھے وہ خود ہر شخص کا مذاق اڑاتا تھا۔ خاص طور سے خواتین کے ساتھ نہایت بدتمیزی کے ساتھ پیش آتا — ان کی ممتا اور پتی ورتا کا بے رحمی سے مذاق اڑایا اس نے۔ اس لئے کلب میں آنے والی خواتین اس سے بظاہر بڑی نفرت کرتی تھیں اس کے باوجود آئے دن کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ اس کا نام وابستہ نظر آتا۔ حامد کہتا تھا عورتوں کے لئے اس میں بڑی کشش ہے وہ خود ہی اس کی جانب کھنچی چلی آتی ہیں۔ وہ خود کہتا تھا کہ کلب آنے والیوں میں سے

روز کسی نہ کسی کو میں ساتھ لے جاتا ہوں۔ میں ان عورتوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہوں۔ مگر شاید وہ موٹی رقم کی لالچ میں چلی آتی ہیں۔

سنا تھا کہ انیل کسی اسمگلنگ کرنے والی پارٹی کا بہت سرگرم رکن تھا۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ کیونکہ بظاہر اس کا کوئی اور پیشہ بھی نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کی جیبیں روپے پیسے سے بھری رہتی تھیں۔

ایک دن ایک بوڑھی بھکارن کو اس نے ایک روپے کے لیے خوب ترسایا تو میں نے کہہ دیا۔

''یار سچ بتاؤ۔ بات کیا ہے تمہارے دل میں کسی کے لئے بھی محبت کیوں نہیں رہی ہے۔''

انیل میری بات سن کر ہنس پڑا، اس نے سگریٹ سلگایا پھر جلتی ہوئی دیا سلائی کو دور اچھال کے بولا۔

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو — میرا دل شاید محبت سے خالی ہے، بالکل تمہارے دل کی طرح — مگر میرا دل اس جھوٹ اور کپٹ سے بھی خالی ہے جسے تم محبت کے نام سے اپنے دل میں بھرے پھرتے ہو —''

''اچھا تو تم کسی بھی انسانی رشتے کی تقدیس کو نہیں مانتے!''

''تقدیس —؟'' وہ ہنسنے لگا ''انسانی رشتوں کی تقدیس —؟ تم مجھے بڑے معصوم لگتے ہو یار — ایسا لگتا ہے کہ تم کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ اس دنیا میں تو میں اپنے وجود پر بھی یقین نہیں رکھتا۔''

یہ من موجی بے رحم اور پاگل پاگل سا انیل مجھے جانے کیوں بہت پسند تھا اور وہ بھی مجھے دوست ماننے بغیر میری طرف بڑھنے لگا تھا۔ اکثر ہم دونوں ساتھ پکچر دیکھنے جاتے۔ کبھی کبھار وہ میرے کمرے پر آجاتا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ پینے کا پروگرام بناتے۔ مگر اس وقت بھی انیل بالکل چپ چاپ رہتا۔ ایسا لگتا تھا کہ تکلف اور ضابطے کی وہ کوئی شرط نہ مانے گا۔ ہر کام کو اسی طرح کرنا چاہتا جیسے اس کی ضرورت ہوتی۔ تکلف اور بناوٹ سے اسے واقعی دشمنی سی تھی۔ ایک بار رات کو گیارہ بجے انیل میرے ہاں آیا۔

میں سمجھ گیا کہ آج وہ پینے کا پروگرام بنا کر آیا ہے۔ مگر وہ کچھ گھبرایا سا لگ رہا تھا —

بکھرا بکھرا سا— کہیں پولیس تو اس کا پیچھا نہیں کر رہی ہے! شاید وہ میرے ہاں پناہ لینے آیا ہے۔

وہ آ کر چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پیتا رہا۔ بار بار چھت کو دیکھتا رہا۔

''میں بھی تمہارا انتظار کر رہا تھا''— میں نے الماری کھول کر بوتل اور گلاس نکالے۔

''نہیں نہیں— میں نہیں پیوں گا آج'' اس نے جلدی سے انکار کیا۔

''کیا بات ہے طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے کیا؟'' میں الماری بند کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

وہ میری بات کا جواب دیے بغیر جلدی جلدی سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ پھر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر بولا۔

''وہ جو کلب والی کرسٹینا ہے نا— وہ کہتی ہے کہ وہ میرے بچے کو جنم دینے والی ہے—''

''اچھا—؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات پر انیل اتنا سنجیدہ کیوں ہے پھر بھی میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ مبارک— لاؤ دوست ہاتھ ملاؤ اور آج ہی کرسٹینا سے شادی کر لو۔ اچھا ہے تمہاری تنہائی کا علاج بھی ہو جائے گا اس بہانے''۔

''مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ کوئی بے قصور بچہ میری وجہ سے اس نفرت انگیز دنیا میں آئے، ہدف ملامت بنا پھرے۔ اس خوفناک دنیا کے اندھیرے کمرے میں اکیلا بند رہے۔ یہ اکیلے پن کی سزا بہت بری ہے— بہت بڑی زیادتی ہے۔'' میں نے دیکھا وہ سچ مچ سر سے پیر تک لرز رہا تھا۔

''مگر تم اس بچے کو اپنا کہتے ہوئے کیوں ڈرتے ہو۔ اگر تم سے اپنا بنا لو گے تو وہ اکیلا کیوں رہے گا''— میں جھنجھلا کے کہا۔

''مگر میرا کیا بھروسہ— نہ جانے مجھے کب اسے اپنا کہنے سے انکار کرنا پڑے''

''تو پھر انجان ہو جاؤ''— اس کی فلاسفی سے بیزار ہو گیا—

''انکار کر دو کہ وہ بچہ میرا نہیں ہے، اور بھئی سچ پوچھو تو کرسٹینا کا بھی کیا اعتبار کہ وہ بچہ تمہارا ہی ہے۔''

''انجان—؟'' انجان کیسے بن جاؤں—؟'' میں نے انیل کو پہلی بار اتنے شدید

کرب سے گزرتے دیکھا تھا۔

''تم کیا جانو وہ بچہ کیسے کیسے عذاب سے گزرے گا'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نہیں نہیں میں اتنی بڑی سزا کسی کو نہیں دے سکتا۔''

انیل سچ مچ خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔

''آخر تم اتنی سی بات سے اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو'' میں نے ہاتھ پکڑ کے اسے پاس بٹھالیا۔ ایک گلاس پانی لاکر اسے دیا اور سمجھا۔

''بھئی تم کرسٹینا سے شادی نہیں بھی کرنا چاہتے تو وہ تعلیم یافتہ ہے کسی نہ کسی طرح اپنے بچے کو پال لے گی۔ آخر سب مائیں اپنی اولاد کو پال لیتی ہیں نا۔ وہ بچہ بھی پل جائے گا۔ کرسٹینا بھی تو ماں ہے وہ اپنے بچے کی خاطر سب کچھ کرے گی۔''

''یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔

''ماں اور بچے کے درمیان محبت کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا — ہر ماں مصلحت پسند ہوتی ہے۔ سماج کے تیور دیکھ کر بچے کو چاہتی ہے۔ کہیں میرا بچہ — میرا بچہ بھی'' — اچانک انیل یوں بول اٹھا جیسے اسے گولی لگی ہو اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا چلا گیا —

اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے۔ اس کا صحیح مقام اب دراصل پاگل خانہ ہے — میں نے اطمینان سے بستر پر لیٹ کر سوچا — بہت ڈینگیں مارتے تھے کہ میں انسانی رشتوں کی اہمیت کو نہیں جانتا؟ کوئی چیز نہیں ہے — اور آج ایک رنڈی کے پیٹ میں اپنا بچہ ہے تو کیسے گھبرائے پھر رہے ہیں مسٹر انیل۔''

صبح کمار نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ رات انیل نے کرسٹینا کو مار ڈالا — اور اس نے خود ہی پولیس اسٹیشن جا کر اس کی اطلاع بھی دیدی ہے۔

☆☆

راستہ بند ہے

راستہ بند ہے۔

بڑھتے ہوئے جرائم اور بے روزگاری کو کم کرنے کے لئے اب چیف منسٹر، منسٹروں کی تعداد بڑھانے اسمبلی کی طرف جانے والے ہیں۔

اس لیے راستہ بند ہے۔

الیکٹریکل پول کی سرخ بتی کسی راکشس کے دیدوں کی طرح چمک رہی ہے۔

اب راستہ کب کھلے گا ——؟

ٹریفک کا شور بڑھتا جارہا ہے — چاروں طرف سڑکوں پر کاروں، اسکوٹر، آٹو رکشا اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم ہے۔ لوگ بے صبری سے راستہ کھولنے کا انتظار کررہے ہیں۔ اسکول جانے والے بچے بیگس سنبھالے کھڑے ہیں۔ سر پر اینٹوں کا ٹوکرا اٹھائے مزدور۔ گھر کا سامان لے جانے والی عورتیں۔ لاٹھی کے سہارے کھڑے ہوئے بوڑھے لوگ۔ ''منی نو بجے ہمارا امتحان شروع ہو جائے گا۔'' ایک بچہ گھبرا کے اپنی بہن سے کہتا ہے۔

''ٹیچر ہمیں پیپر نہیں دیں گی۔'' منی رونے لگتی ہے اور پھر بھائی کا ہاتھ پکڑ کے کہتی ہے۔

''آؤ — اپن آگے چلے جائیں گے۔''

سب بچے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے ہیں۔ ٹریفک کانسٹبل ڈنڈا مار کے انہیں پیچھے ڈھکیل دیتا ہے۔

''اُدھر دیکھو —— لال بتی نظر نہیں آرہی ہے ——؟''

''مگر ہمارا ایگزام ہے انکل —'' بچے رونے لگتے ہیں۔

ان بچوں کو جانے دو یاری لمبے بالوں والا ایک نوجوان کہتا ہے اس کے ہاتھ میں گٹار

ہے ''دس بجے میرائی ۔ وی پر پروگرام ہے۔'' مجھے بھی اب جانے دو۔

''وہ آگے بڑھا تو کانسٹبل نے ڈنڈا مار کے پیچھے ڈھکیل دیا۔

اسکوٹر پر سوار ایک نوجوان سب کو ہٹا کر تیزی سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر کانسٹبل نے اسے ڈنڈا مار کر گرا دیا۔ اسکوٹر اس کے اوپر گر گئی۔ اس کے سر سے خون نکلنے لگا۔ سب لوگ جمع ہو گئے —— چیخ و پکار ہونے لگی۔ کچھ لوگ کانسٹبل کو مارنے دوڑے مگر اس نے سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو اکھٹا کر لیا اور زخمی نوجوان سے سو روپے جرمانہ لے کر اسے آگے جانے دیا۔

''دس بجے اے۔ پی ۔ ایکسپریس چلی جائے گی۔ مجھے دہلی جانا ہے جانے دو بھائی'' آٹو میں سوار ایک نوجوان نے بلک کر کہا۔

''آپ سب کہیں نہیں جائیں گے۔ چیف منسٹر کے آنے تک کوئی آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

کانسٹبل نے سیٹی بجا کر؟؟ سب کو روک دیا۔

''یہ راستہ کدھر جاتا ہے —؟ ہونڈا کار سے منہ باہر نکال کر ایک صاحب نے رکشا والے سے پوچھا۔

''ابھی تو کدھر بھی نہیں جاتا صاحب۔'' رکشا والے نے بیزار ہو کر کہا۔

''چیف منسٹر کے جانے کے بعد معلوم ہوگا کون سا راستہ کدھر جاتا ہے؟''

''بھائی صاحب ہمیں جانے دو۔'' آٹو رکشا میں بیٹھی ایک عورت رو رو کر کانسٹبل سے کہہ رہی تھی۔

''میری بیٹی کے بچہ ہونے والا ہے اسے جلدی سے ہاسپٹل لے جانا ہے۔''

''ارے بس کرو اماں بچے پیدا کرنا —'' اسکوٹر والے ایک نوجوان نے بیزار ہو کر کہا۔

''سامنے اتنے بچے کھڑے ہیں۔ انہیں آگے جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔''

''اُو بابو۔ اس لنگڑے لاچار کو ایک روپیہ دے دو۔ صبح سے بھوکا ہوں۔ اللہ آپ کو ہزار روپے دے گا۔'' ایک صاحب نے جلدی سے پرس کھولا۔ بھکاری کو ایک روپیہ دیدیا اور بھکاری اس کو بے شمار دعائیں دینے لگا۔

ان صاحب کے پاس ایک چھوٹی سی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے اپنی اماں سے پوچھا۔

اماں۔ کیا اللہ میاں بھکاری کی دعا سن لیتے ہیں؟ تو پھر وہ اپنے لیے اللہ میاں سے

ہزار روپے کیوں نہیں مانگ لیتا—؟''

''افوہ— مجھے تو چکر آ رہا ہے— جانے راستہ کب کھلے گا— میرا پریشر بڑھ گیا ہے۔''

ایک بوڑھے سے صاحب نے گٹار والے نوجوان کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

''آپ کا گھر کہاں ہے صاحب—؟ میں آپ کو پہنچادوں گا— ''ان کے قریب کھڑے ہوئے آٹو رکشا والے نے بڑی ہمدردی سے انہیں دیکھا۔

''میرا گھر کہاں ہے—؟ تیس برس ہو گئے یہ سوچتے ہوئے کہ کیا وہ میرا گھر ہے—؟ تم کیسے پہنچادو گے وہاں جانے کا راستہ تو میں بھی نہیں جانتا— ''انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''پاگل بڈھا ہے''— آٹو رکشا والا گٹار والے لڑکے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ آخر راستہ کب کھلے گا۔ ہم یہاں کب تک کھڑے رہیں گے—؟

اسکول جانے والے بچے بیزار ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک بڈھے سے پوچھا۔ اس کے سر پر اینٹوں کا ٹوکرا تھا۔ ہاتھ میں بندھی ہوئی رسی تھی۔

''جانے راستہ کب کھلے گا بیٹے۔ مجھے دیکھو! اتنا بوجھ اٹھائے کب سے کھڑا ہوں۔''

''لڑکے نے بڑے غور سے بوڑھے کو دیکھا اور پاس کھڑی اپنی بہن سے بولا۔

''منی—— کیا ہم بھی یہاں کھڑے کھڑے اس آدمی کی طرح بوڑھے ہو جائیں گے—؟''

''ہمیں پیچھے لوٹ کر دوسری سڑک پر بھی نہیں جانے دے رہے ہیں۔''ایک سائیکل سوار نے کہا۔

''چیف منسٹر آنے والے ہیں۔ اس لیے سڑکوں کے کنارے والی پھلوں ترکاریوں کی ٹرالی۔ فٹ پاتھ پر سونے والے اندھے اپاہج فقیروں کو ہٹا کر وہاں صفائی کی جا رہی ہے۔''

''آج سڑکوں پر اتنی صفائی کیوں ہو رہی ہے ممی—؟ کیا منسٹر کے آنے سے کوئی بیماری پھیل جاتی ہے—؟''ایک بچے کے اس سوال پر آس پاس کھڑے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔

پھر ایک ویگن۔ آ کر سب کو ہٹاتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ کانسٹبل سیٹی بجا کر اس کی طرف دوڑا— کار والے نے کانسٹبل کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں کچھ دیدیا— اور کار آگے بڑھ گئی۔

اس کار کے آگے جاتے ہی ہجوم کو ہٹانے کے لیے زور زور سے ہارن بجاتی ایک اور

میڈم آگے بڑھنے لگیں ۔کانسٹبل نے سیٹی بجا کرانہیں روکا۔

میڈم جی راستہ بند ہے۔اوپر نہیں دیکھا۔آپ نے؟

''لیکن مجھے ابھی ایک پارٹی میں جانا ہے۔ہٹوتم نہیں جانتے میں کون ہوں—!میں ایک پارٹی کی ممبر ہوں۔میٹنگ میں جارہی ہوں۔لو۔دیکھومیرا وزیٹنگ کارڈ—''

''مگر چیف منسٹر نے آپ کا راستہ بند کردیا ہےتواب سوچ لومیڈم جی کہ آپ کس پارٹی کی دعوت میں جائیں گی اب؟

گٹاروالےلڑکے نے ہنس کرکہاتو آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی ہنسنے لگے۔

کانسٹبل پھر میڈم جی کی کار کے اندر جھانک کر کچھ بولا۔میڈم نے اس کے ہاتھ میں کچھ تھمادیااور کارآگے چلی گئی۔

''یا اللہ—میرے اللہ راستہ کھول دے۔اتنا بوجھ اٹھائے کب تک کھڑی رہوں میں—؟

سرپہ لکڑیوں کا بوجھ اٹھائے گود میں بچے کوسنبھالے ایک عورت رونے لگی۔

''اتنی زور سے کیوں چلا رہی ہے اماں''— گٹاروالےلڑکے نے اس سے کہااوراس کے بچے کواپنی گود میں لے لیا۔

''کیا تمہارے پکارنے سے اللہ میاں راستہ کھولنے آجائیں گے—؟''

''ارے اللہ میاں کسی نیک بندے کوبھیج دیں جوآکر راستہ کھول دے۔''عورت نے بیزار ہوکر کہا۔

''ذراسنئے مولوی صاحب۔یہ عورت کیا کہہ رہی ہے— گٹاروالے کے پاس کھڑے ایک نوجوان نے مولانا سے کہا۔

''ہاں—اب اللہ یادآرہا ہے تجھے—؟''مولانا نے غصہ میں عورت کی طرف دیکھا۔

''سالے شراب پیتے ہیں۔جھوٹ بولتے ہیں گالیاں بکتے ہیں— کبھی نمازنہیں پڑھتے۔اللہ کو یادنہیں کرتے—''اپنے آس پاس اتنے لوگوں کودیکھ کرمولوی صاحب نے وعظ شروع کردیا—

''ارے چپ بیٹھومولوی صاحب—''عورت کے پیچھے کھڑے ایک مزدور نے غصہ میں کہا۔

''پیٹ بھر کے کھانا کھالیتے۔وضو کرنے کو پانی مل جاتا ہے اچھے کپڑے پہن کر آپ نماز پڑھتے ہیں—ہم کیا کرتے ہیں—؟ آکر دیکھو نا—دن بھر پتھر پھوڑتے ہیں۔اینٹوں کے ٹوکرے سر پر رکھ کر تین منزل والی بلڈنگ پر جاتے ہیں۔رات کو اسی بلڈنگ کے نیچے پتھر کا تکیہ بنا کر سو جاتے ہیں ہم۔''

''چپ رہ بھائی—اس وقت لڑائی جھگڑا رہنے دے کھڑے کھڑے پاؤں تھک گئے۔ایک صاحب نے بور ہو کر کہا۔

''ہم کیوں لڑائی کریں گے۔مولوی صاحب؟''

''بلڈنگ بن گئی ہے تو بلڈر صاحب ہماری جھونپڑی توڑ رہے ہیں وہاں سے چلے جاؤ بول رئیں......''

ہم کہاں جائیں—سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے بچوں کا ہاتھ تھامے ایک مزدور عورت پوچھ رہی تھی۔

اس کے پیچھے سر پر سامان کے ٹوکرے اٹھائے تین چار بچے کھڑے تھے۔

''تو پھر کیا بلڈنگ بنانے کے بعد اس بلڈنگ میں رہنے کا ارادہ تھا تمہارا—''مولوی صاحب نے ہنس کر پوچھا۔

''بلڈنگ بنانے کے لیے ہماری جھونپڑیاں توڑ دیے ہمارا سامان اٹھا کر پھینک دئے، کہیں بھی چلے جاؤ۔بول رئیں اب دوسری بلڈنگ میں کام ملنے تک ہم کہاں رہنا صاحب—؟

بہت سے مزدور عورتیں بچوں کو گود میں اٹھائے سروں پر سامان رکھے پریشان ہو رہی ہیں۔مردوں نے زیادہ وزنی سامان سروں پہ رکھ لیا تھا۔سر پر لکڑیوں کا بنڈل اٹھائے ایک بوڑھی مزدور عورت کو ڈھکیل کر آگے بڑھنے لگی۔

''بیٹے— کورٹ جانے کا راستہ کدھر ہے—''اس نے گٹار والے نوجوان سے پوچھا۔

''کورٹ—؟ کورٹ کیوں جا رہی ہو ماتا جی—؟''ایک اسکوٹر والے نے بوڑھی عورت کو ہنس کر دیکھا۔

''میں اب وہاں جاؤں گی۔ہمارے گھر توڑ دیے سامان پھینک دیئے کیا ہم سڑکوں پر

رہیں گے اب؟ میں وہاں جا کر پوچھوں گی جہاں انصاف ہوتا ہے''— بوڑھی عورت زور زور سے رونے لگی— گٹار والے لڑکے نے اسے تھام لیا—

آپ کے لیے وہاں جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے ماں جی جہاں انصاف ہوتا ہے۔ آگے راستہ بند ہے۔''

مرسیڈیز کار میں بیٹھنے والے صاحب مسلسل ہارن بجائے جا رہے تھے۔

وہ اپنے پاس بیٹھے دوست سے باتیں کر رہے تھے۔

''آپ کے اوپر تو کئی کروڑ کے Scam کا کیس چل رہا ہے—؟

''ہاں۔ میں اسی پرابلم پر بات کرنے چیف جسٹس کے پاس جا رہا ہوں'' انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

''کیا وہ آپ کی بات سنیں گے—؟'' ان کے دوست نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں ہاں— '' دوست نے لاپروائی سے کہا۔

''میں ان سے پہلے بھی مل چکا ہوں انھوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ گورنمنٹ کے ڈپارٹمنٹ میں کروڑوں روپے کا Scam کیسے ہوتا ہے—؟ مجھے چیف جسٹس صاحب کے سوال پر ہنسی آ گئی۔ میں بولا—

بہت مشکل کام ہے سر آپ جیسے لوگ نہیں کر سکتے۔ اسی کرسی پر بیٹھو اور ہم سے لے کر موج مناؤ ان کو غصہ آ گیا— آج مجھے بلائے ہیں۔''

''ارے— اب کیا ہوگا—؟'' ان کے دوست نے گھبرا کے کہا۔

''اب ان کے پی اے سے بات کرلیں گے۔ صاحب کے ساتھ کوئی بات ہو جائے گی۔''

انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

''منسٹر صاحب کے آنے میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ وہ کیا کر رہے ہیں انکل—؟'' ایک لڑکے نے گٹار والے سے پوچھا۔

''بہت کام کرنا پڑتے ہیں منسٹر کو۔— '' گٹار والے نے بچے کو سمجھایا۔

''میٹنگ میں جانے سے پہلے انہیں میک اپ روم میں جانا پڑتا ہے— آج کس

پارٹی کا کلر چہرے پر لگانا ہے۔ پھر سوچنا پڑتا ہے۔ کون سی پارٹی والا ڈریس بدلنا ہے؟ اور پھر ٹی وی پر جو کہنا ہے ویسا ہی میک اپ کرنا پڑتا ہے۔''

ہٹو ہٹو— بھاگو بھاگو— راستہ کیوں بند کردیئے۔ چیختے چلاتے روتے ہوئے مرد وں عورتوں کا ایک ہجوم آگے بڑھنے لگا۔

اچھا؟ غریبی ختم کرنے کے لیے منسٹر جن غریبوں کو ختم کرنے کا پلان بنا لیتے ہیں شاید آج وہی اعلان ہونے والا ہے۔''

''مسجد میں بم پھینک دے تو ہماری بستی میں پولس والے آکر لوگوں کو مار رہے ہیں۔''

کتنے لوگ مر گئے صاحب'' وہ سب رو رہے تھے۔ چلاّ رہے تھے۔''

پولیس کو یہ کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ میڈیا میں ٹی۔ وی پر سرکار کے کام کا تماشہ کیسے دکھائیں گے اور پھر—''

مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بہت سے روتے چلاّتے آدمی بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ سب کو ہٹا کر آگے بڑھنے لگے اور پولیس والوں کی لاٹھی کی مار سے رونے لگے۔

''دیکھو— وہ ہمیں مارنے آرہے ہیں—؟

''وہ تمہیں کیوں مار رہے ہیں—؟ کیا تم مسلمان ہو—؟

''نہیں— اب ہم آگے والے مندر میں چھپ جائیں گے۔''

''اس لیے تو بچ گئے آج''— ایک شیروانی والے مولانا نے کہا۔

''اچھا—؟ کیا مندر کے اندر چلے جاؤ گے گٹار والے نے ہنس کر کہا۔

''پہلے پجاری کو بتانا پڑے گا کہ تم برہمن ہو—— شودر ہو—— تمہارے ہاتھ میں کتنے بم ہیں—؟ اب بھگوان کے سامنے جانے سے پہلے بھی سیکوریٹی گارڈ تلاشی لیتا ہے پجاری۔

''اوچھو کرے— اپنی زبان بند کر۔ بہت دیر سے تیری بکواس سن رہا ہوں'' ایک صاحب نے غصہ سے کہا'' لوگ پریشان ہیں تو ٹی وی کا کامیڈی پروگرام کر رہا ہے—؟

''چیف منسٹر آنے والے ہیں۔ آپ لوگ شانت رہئے۔ ہم ان کا راستہ روک دیں گے۔ ان سے پوچھیں گے کہ وہ ہمارے لیے کیا کرنے والے ہیں—؟ ان صاحب نے پریشان لوگوں کو سمجھایا۔

مجھے معلوم ہے کہ چیف منسٹر کیا کہیں گے — ؟ گٹار والے لڑکے نے ہاتھ اٹھا کر سب کے سامنے آ کر — مسخرے کی طرح گردن اونچی کر کے زور زور سے کہا —

"آپ سب کی بپتا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا — اب میں اعلان کرتا ہوں کہ:

جو ہندو ہیں انہیں آگ میں جھونک دو۔

جو مسلمان ہیں انہیں خاک میں ملا دو — جے ہند — "

☆☆

21 31

RASTA BAND HAI

(Short Stories)

by

Jeelani Bano

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com